إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

اگست ۲۰۱۲ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد ۱۶، شمارہ ۸ اگست ۲۰۱۲ء/ رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ

مشمولات

○فکر و نظر

میر جعفروں کی کثرت — مدیر — ۲

○تعلیم و تربیت

جدید تعلیم کی زہرناکی اور اصلاح
علماء کرام کی خدمت میں ایک اہم سوال — شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ — ۳

مولانا حسین احمد مدنیؒ کا مرتب کردہ نیا دینی نصاب
ایک تجزیاتی مطالعہ — ڈاکٹر محمد امین — ۶

پاکستان میں تعلیم کی آئینی اساس — پروفیسر ملک محمد حسین — ۱۱

○اسلام اور مغرب

مسلم معاشرے پر سیکولرزم کے اثرات — ڈاکٹر محمود احمد غازی — ۱۸

○پاکستانیات

پاکستان میں انتہا پسندی اور دہشت گردی — ڈاکٹر محمد امین — ۳۱

○دعوت و تبلیغ

قادیانی حضرات کو دعوتِ اسلام کیسے دی جائے؟ — ارشد سراج الدین — ۳۶

○میڈیا

پاکستان کا کرپٹ الیکٹرانک میڈیا — ملک احمد سرور — ۴۳

مسلمانوں کے خلاف مغرب کی میڈیا وار — مولانا عیسیٰ منصوری — ۴۵

پیمرا اور پریس کونسل آف پاکستان سے شکایت کا طریق کار — ۵۴

○استفسارات

مجوزہ تحریک اصلاح و خدمت پر چند اعتراضات — مدیر
کیا آپ ڈھائی اینٹ کی مسجد الگ بنانا چاہتے ہیں؟ — ۵۶
سول سوسائٹی پر فوکس کیوں؟ — ۵۷

○تبصرہ کتب

امریکی زوال پر تھامس فریڈمین و مینڈل بام کی کتاب — قیوم نظامی — ۵۹

’اوباما کی خفیہ جنگیں‘ از ڈیوڈ سانگر — ڈاکٹر ملیحہ لودھی — ۶۱

فکر و نظر

میر جعفروں کی کثرت

کل احباب کی ایک مجلس میں نیٹو سپلائی کی بحالی، وزیرستان میں ہونے والے آپریشن اور ڈاکٹر شکیل آفریدی کا ذکر چھڑ گیا تو ایک صاحب کہنے لگے کہ میں اکثر سوچتا ہوں کہ مسلمان قوم میں میر جعفروں اور میر صادقوں کی کثرت کیوں ہے؟ ہماری ماضی کی تاریخ بھی ضمیر فروشوں اور غداروں کے ذکر سے بھری پڑی ہے اور آج بھی ان کی کمی نہیں۔

ایک دوسرے صاحب نے کہا کہ آپ پرویز مشرفوں، زرداریوں، اور شکیل آفریدیوں ہی کا نام کیوں لیتے ہیں، جبہ و دستار پہنے علماء، الفاظ کی طوطا مینا اڑانے والے ادیبوں اور صحافیوں اور گز بھر لمبی زبان رکھنے والے اینکر پرسنوں بلکہ خود شمشیر بکف مجاہدین میں ڈالر وصول کرنے والے اور بکے ہوئے لوگ آپ کو نظر نہیں آتے؟

تیسرے صاحب نے کہا کہ آپ اس معاملے کو پاکستان تک محدود کیوں رکھتے ہیں؟ ہمارے ہاں عالم اسلام کی سطح پر کرزئیوں، حسنی مبارکوں، عرب شیوخ اور بادشاہوں بلکہ افریقہ سے لے کر شرق اوسط اور مشرق بعید سے لے کر وسط ایشیاء تک ۵۷ مسلم ممالک کے حکمرانوں، سپہ سالاروں، صحافیوں، ادیبوں، علماء، مجاہدین، سب کا جائزہ لے لیجیے ان میں سے بہت سے آپ کو ڈالرزدہ نظر آئیں گے۔

چوتھے نے کہا کہ سوال تو یہی ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ مسلمانوں کی صفوں میں غداروں اور ضمیر فروشوں کی کثرت کیوں ہے؟ کیا یہ ہمارا قومی کیریکٹر ہے؟

ہم نے کہا کہ ہمیں فوری طور پر اس کا کوئی جواب نہیں سوجھ رہا سوائے اس کے کہ قوم کی حیثیت ایک درخت کی سی ہوتی ہے۔ جب تک اس کی جڑیں زمین میں پیوست ہوتی ہیں اور وہ مضبوطی سے جما کھڑا ہوتا ہے اس کے پتے بھی سرسبز رہتے ہیں اور شاخوں سے جڑے رہتے ہیں اور شاخیں بھی مضبوط اور تنوں میں پیوست رہتی ہیں لیکن جب درخت کی جڑیں کھوکھلی اور کمزور ہو جائیں تو درخت گو کھڑا نظر آتا ہے لیکن جڑیں زمین میں مضبوطی سے پیوست نہ ہونے کی وجہ سے زمین سے غذا جذب نہیں کر سکتیں۔ نتیجتاً اس کی شاخیں خشک ہونے لگتی ہیں اور پتے خشک ہو کر جھڑنے لگتے ہیں اور آپ جانتے ہیں سوکھے پتے کا تو کوئی وزن نہیں ہوتا۔ ہوا اسے جدھر چاہے اڑا لے جاتی ہے اور وہ راہ چلتے مسافر کے پاؤں تلے آ کر بھی چرمرا کر ختم ہو جاتا ہے اور دشمن کے سامنے تو اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی۔

یہی حال امت مسلمہ کا ہے کہ اس کے درخت کی جڑیں اس کے نظریہ حیات میں مضبوطی سے پیوست نہیں ہیں لہٰذا اس کی شاخیں سوکھ رہی ہیں اور پتے زرد ہو کر گر رہے ہیں اور زمانے کی ٹھوکروں کی زد میں ہیں۔ انہیں جو چاہے اچک لے، روند ڈالے یا خرید لے بلکہ یہ بیچارے تو اپنی قیمت بھی نہیں لگوا سکتے اور اکثر سو من پیاز

بھی کھاتے ہیں اور سوجوتے بھی۔

تعلیم و تربیت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

جدید تعلیم کی زہرناکی اور اصلاح

علماء کرام کی خدمت میں ایک اہم سوال

جدید تعلیم سے متعلق حضرت شیخ الہندؒ کے یہ ارشادات اس تقریر کے اقتباسات پر مشتمل ہیں جو آپ نے ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افتتاح کے موقع پر کی۔ عنوان البتہ ہمارا ہے اور آخر میں البرہان کا تبصرہ بھی۔ مدیر

''آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کبھی بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں بے شک کہا گیا کہ انگریزی تعلیم کا آخر اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اُڑائیں یا حکومت وقتیہ کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کا جاہل رہنا ہی اچھا ہے۔ اب ازراہِ نوازش آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ تعلیم سے روکنا تھا یا اس کے اثر بد سے؟ اور کیا یہ وہی بات نہیں ہے کہ جس کو آج مسٹر گاندھی اس طرح ادا کر رہے ہیں کہ ان کالجوں کی اعلیٰ تعلیم بہت اچھی صاف اور شفاف دودھ کی طرح ہے جس میں تھوڑا سا زہر ملا دیا گیا ہو۔ بارے خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری قوم کے نواجوں کو توفیق دی کہ وہ اپنے نفع وضرر کا موازنہ کریں اور دودھ میں جو زہر ملا ہوا ہے اس کو کسی بھبکہ کے ذریعے سے علیحدہ کر لیں۔ آج ہم وہی بھبکہ نصب کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں اور آپ نے مجھ سے پہلے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ بھبکہ مسلم نیشنل یونیورسٹی ہے۔ مطلق تعلیم کے فضائل بیان کرنے کی ضرورت اب میری قوم کو نہیں ہے کیونکہ زمانہ نے خوب بتا دیا ہے کہ تعلیم سے ہی بلند خیالی، تدبر اور ہوش مندی کے پودے نشوونما پاتے ہیں اور اسی کی روشنی میں آدمی نجاح وفلاح کے راستہ پر چل سکتا ہے۔ ہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے بالکل آزاد ہو، کیا باعتبار عقائد وخیالات کے اور کیا باعتبار اخلاق واعمال کے اور کیا باعتبار اوضاع واطوار کے، ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔

ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے

غلام نہ پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ بغداد میں جب مدرسہ نظامیہ کی بنیاد ایک اسلامی حکومت کے ہاتھوں سے رکھی گئی ہے تو اس دن علماء نے جمع ہو کر علم کا ماتم کیا تھا کہ افسوس آج سے علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لیے پڑھا جائے گا تو کیا آپ ایک ایسے کالج سے فلاح قومی کی امید رکھتے ہیں جس کی امداد اور نظام میں بڑا از بردست ہاتھ ایک غیر اسلامی حکومت کا ہو۔

ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ اُمت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا ہے۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو اگر طلبہ اپنے اصول وفروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کردیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنی ہم قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درس گاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ ایک آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ اور جس کا تمام تر نظامِ عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو''۔

''اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔ کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتائیں لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے''۔

البرہان

مندرجہ بالا الفاظ حضرت شیخ الہندؒ سربراہ دارالعلوم دیوبند کی اس صدارتی تقریر کے ہیں جو آپ نے اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامی کی تاسیس کے وقت علی گڑھ میں کی تھی۔ آج اگست ۲۰۱۲ء میں کہ حضرت کی اس تقریر کو ایک صدی ہونے کو آرہی ہے اور مملکت خداداد پاکستان کو قائم ہوئے ۶۵ برس گزر چکے ہیں، سوال یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام نے، اور خصوصاً حضرت کے نام لیوا دیوبند کے علماء کرام نے، جدید تعلیم کی اس 'زہرناکی' کو ختم کرنے اور جدید تعلیم کے ایسے ادارے قائم کرنے کے لیے جن کا

ُتمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی احساسات پر مبنی ہو ٗ کیا کوششیں کی ہیں؟ دیوبند و علی گڑھ یعنی قدیم وجدید کی تقریب اور جدید تعلیم کی اصلاح کے جس عمل کا آغاز حضرت والاؒ نے ۱۹۲۰ء میں کیا تھا اس کی تکمیل کے لیے کیا جدوجہد کی ہے اور اس ضمن میں کتنا فاصلہ طے کیا ہے؟

اس گستاخی پر اگر علماء کرام ہمیں معاف فرمائیں تو ہم عرض کریں گے کہ نہ صرف یہ کہ انہوں نے ان دونوں مقاصد کے لیے کوئی کام نہیں کیا بلکہ اس کے بالکل مخالف دو کام کیے ہیں: ایک تو یہ کہ برصغیر میں مسلم مملکت کے وجود میں آنے کے باوجود درس نظامی پر جمود اختیار کرلیا ہے جس کے بارے میں حضرت والاؒ کے شاگرد رشید اور (بعد میں) دیوبند کے سربراہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا تھا کہ:

> ُدرس نظامی میں بھی بہت سے علوم کو ضرورت وقت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جو کہ ضیاع عمر کا باعث اور خسارہ دین و دنیا کا سبب ہے اور بہت سے ضروری فنون و کتب سے چشم پوشی بھی گوارا کرنے کی بدنمائی اس میں موجود ہے ٗ۔
>
> (مولانا کا مرتب کردہ دینی مدارس کا نیا نصاب ۔ اصول وقوانین کلیہ ۷)

اور دوسرے یہ کہ اب کئی بڑی دینی جامعات نے مغربی قوتوں اور حکومت پاکستان کے دباؤ پر اس ُزہریلی ٗ جدید تعلیم کو، جیسی وہ ہے اور اسے اسلامی تقاضوں کے مطابق تبدیلی و اصلاح کے عمل سے گزارے بغیر، اپنے اداروں میں اس کی تعلیم وتدریس شروع کردی ہے اور اس پر غور کرنے کی تکلیف ہی نہیں کی کہ اس زہریلی تعلیم کے دوررس نتائج کیا نکلیں گے؟

علماء کرام کے اس رویے کے جو نقصانات مسلم معاشرے کو پہنچ رہے ہیں ہم البرہان میں ان پر وقتاً فوقتاً اظہار خیال کرتے رہتے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے اس طرز عمل نے ۱۔ پاکستان میں سیکولرزم کو فروغ دیا ہے۔ ۲۔ معاشرے اور حکومت کی باگ ڈور ان افراد کے ہاتھوں میں دے دی ہے جن کی تعلیم وتربیت غیر اسلامی اصولوں پر ہوئی ہے ۳۔ معاشرے کے کروڑوں افراد ان جدید تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہوکر نکل رہے ہیں جن کی تعلیم وتربیت میں علماء کرام کا اور اسلامی اصولوں کا کوئی موثر عمل دخل نہیں؛ اور ۴۔ موجودہ مغرب زدہ مسلم معاشرے میں ُدینی مدارس ٗ اور ُدرس نظامی ٗ سے فارغ ہونے والے طلبہ کو غیر متعلق اور غیر موثر بنادیا ہے؟

کاش! علماء کرام ہماری ان دردمندانہ گزارشات پر غور فرمائیں، خصوصاً حضرت شیخ الہندؒ کے نام لیوا بڑی دینی جامعات چلانے والے اور ُوفاق المدارس العربیہ ٗ والے بلکہ ہم تو کہیں گے کہ سارے وفاقوں کے قائدین علماء کرام کو مل بیٹھ کر اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے اور اس کے حل کے لیے عملی اقدامات

کرنے چاہئیں۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا مرتب کردہ
دینی مدارس کا نیا نصاب
ایک تجزیاتی مطالعہ

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے مرتب کردہ نصاب کی کاپی مولانا زاہد الراشدی صاحب (ڈائریکٹر شریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ) کے ہاتھ اس وقت لگی جب وہ بنگلہ دیش (مرحوم مشرقی پاکستان) کے دورے پر گئے۔ موضوع سے دلچسپی کی خاطر انہوں نے ہمیں بھی اس کا ایک نسخہ مہیا کیا، جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ جب ہم نے البرہان کا اجراء کیا تو ہمارے ذہن میں تھا کہ اسے پاکستانی دینی مدارس کے علم میں لانے کے لیے قسط وار شائع کر دیا جائے چنانچہ یہ البرہان کے شمارہ دسمبر ۲۰۱۱ء اور جنوری، فروری، اپریل اور مئی ۲۰۱۲ء میں پانچ قسطوں میں شائع کر دیا گیا۔ بالاقساط شائع ہونے کی وجہ سے اور زبان کی قدامت کی بناء پر مولانا مرحوم کی تحریر کا موثر اور سریع الفہم ہونا مخدوش لگا تو ہم نے اس کے تجزیاتی مطالعے کی ضرورت محسوس کی چنانچہ یہ سطور حاضر خدمت ہیں جن کی تکمیل پر اس نصاب کو ان شاء اللہ، ایک کتابچے کی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔ (مدیر)

تاریخ تدوین

مولانا مدنیؒ نے یہ نصاب کب مدون کیا؟ ناشر الحاج گلزار میاں صاحب نے اس نصاب کی طبع دوم کا سنہ طباعت ۱۹۷۳ء لکھا ہے اور 'عرض ناشر' میں کہا ہے کہ یہ نصاب آج سے تقریباً چالیس سال پہلے مولانا مدنیؒ نے مرتب کیا تھا یعنی لگ بھگ ۱۹۳۳ء میں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مدنیؒ نے، جنھوں نے دیوبند سے تکمیل تعلیم کے بعد طویل عرصہ مدنیہ منورہ میں گزارا، یہ نصاب دارالعلوم دیوبند جانے سے پہلے مرتب کیا اور ان کا اس پر عمل درآمد کا ارادہ بھی تھا لیکن غالباً حالات نے انہیں اس کا زیادہ موقع نہیں دیا۔

اس تمہید کے بعد آیئے اب اس نصاب کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں۔

اس نصاب کی منفرد خصوصیات

۱۔ دینی مدارس کا نصاب مقدس اور نا قابل تغیر نہیں ہوتا

مولانا نے اپنے مرتب کردہ نصاب کے مقدمے میں زور دے کر یہ بات کہی ہے کہ تعلیمی اداروں کا نصاب نہ تو مقدس ہوتا ہے اور نہ نا قابل تغیر۔ یہ بات انہوں نے بطور ایک اصول کہی ہے (اور جدید مغربی تعلیم بھی اسی اصول کی تائید اور اس پر عمل کرتی ہے)۔ مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ نصاب کا قدیم ہونا اسے مقدس نہیں بناتا اور انہوں نے ماضی میں دینی مدارس کے نصاب کے تغیر وتبدل اور اسلاف کے طرزِ عمل کی گواہی پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ تعلیمی اداروں کے نصاب پر نظر ثانی ہوتے رہنی چاہیے چنانچہ انہوں نے اپنے بنائے ہوئے اس نصاب کے بارے میں لکھا ہے کہ اس پر ہر تین سال بعد نظر ثانی کی جایا کرے گی (اصول وقوانین کلیہ، ۲۵)۔

یہ نکتہ بہت اہم ہے اور ہمارے دینی مدارس کے لیے اس میں سیکھنے کو بہت سا سبق ہے کیونکہ ہمارے دینی مدارس کا عمومی رجحان اپنے نصاب کو مقدس اور نا قابل تغیر سمجھنے کا ہے حالانکہ ہم جیسے مدارس کے بہی خواہ عرصے سے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرا رہے ہیں لیکن دینی مدارس اس پر توجہ نہیں دیتے۔ یہ غالباً ۱۹۹۵ء کی بات ہے جب ہم بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں پڑھاتے تھے کہ متحدہ علماء کونسل کے مولانا عبدالرؤف ملک صاحب نے عالم عرب کے کسی ادارے سے مل کر دینی مدارس کے نصاب پر دو روزہ ورکشاپ اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں رکھی۔ موضوع سے دلچسپی کی خاطر ہم بھی اس ورکشاپ میں حاضر ہوئے۔ دوران کارروائی ایک دفعہ جب مائیک گردش کر رہا تھا تو مائیک ایک مولانا صاحب کے پاس آیا۔ اونچا لمبا قد، گورا رنگ، مسجع داڑھی، سر پر جناح کیپ۔ انہوں نے گلا کھنکھارا اور ایک جملہ کہا کہ ہمارا نصاب قرآن وسنت پر مشتمل ہے لہٰذا اس میں کسی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں' اور یہ کہہ کر حقارت سے مائیک آگے کھسکا دیا۔ میں نے ساتھ بیٹھے آدمی سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ اس نے بتایا کہ یہ مولانا عبدالقیوم ہزاروی ہیں، جامعہ رضویہ غوثیہ لاہور کے مہتمم اور حنفی بریلوی مدارس کے وفاق 'تنظیم المدارس' کے صدر۔ مولانا مرحوم نے تو اکل کھرے اور دوٹوک الفاظ میں یہ کہہ دیا۔ باقی علماء کرام بھی اگرچہ زبان سے یہ نہیں کہتے لیکن ان کی اکثریت سمجھتی یہی ہے کہ درس نظامی ایک مقدس گائے ہے جسے ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا حالانکہ مولانا مدنیؒ جیسے بڑے آدمی نے اپنے اس مجوزہ نصاب کے مقدمے میں درس نظامی پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ 'درس نظامی میں بھی بہت سے علوم کو ضرورت وقت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جو کہ ضیاع عمر کا باعث اور خسارہ دین ودنیا کا سبب ہے اور بہت سے ضروری فنون وکتب سے چشم پوشی بھی گوارا کرنے کی بدنمائی اس میں موجود ہے' (اصول وقوانین کلیہ

۷)۔

دینی مدارس کے علماء کرام کے اس طرزِ عمل کی کہ 'درس نظامی مقدس ہے اور اسے چھیڑا نہیں جا سکتا' کی ایک بڑی وجہ ہمارے حکمرانوں کا رویہ بھی ہے۔ ان حکمرانوں نے نہ تعلیمی ثنویت ختم کی اور نہ جدید تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالا اور انہوں نے دینی مدارس کی اصلاح میں بھی کوئی خیر خواہانہ دلچسپی نہیں لی۔ ہاں! جب مغربی ممالک کی طرف سے دباؤ پڑتا ہے یا وہاں سے دینی مدارس میں تبدیلیاں لانے کے نام پر ڈالر ملتے ہیں تو حکمران تھوڑی دیر کے لیے حرکت میں آتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے علماء کرام اس طرح کے دباؤ کو قبول نہیں کرتے اور دینی مدارس کے تحفظ کے نام پر اکٹھے ہو کر مزاحمت کرتے ہیں۔ اس مزاحمتی ردّعمل اور دینی مدارس میں تبدیلی نہ لانے کے اظہار و اصرار نے ان کے اندر لاشعوری طور پر ایک ایسے مزاحمتی نفسیاتی رویے کو جنم دیا ہے جو دینی مدارس کے نصابات وغیرہ میں کوئی بڑی تبدیلی لانے کے معاملے پر ہمدردانہ غور کا ماحول پیدا ہونے ہی نہیں دیتا۔ ورنہ علماء کرام میں ایسے جہاں دیدہ افراد موجود ہیں جو عصری ضروریات وتحدیات کا ادراک رکھتے ہیں اور موجودہ نصاب کو بدلنا چاہتے ہیں لیکن دینی مدارس کا اور ان کے وفاقوں کا عمومی رجحان یہی ہے کہ دینی مدارس ٹھیک کام کر رہے ہیں بلکہ بہت عمدہ کام کر رہے ہیں اور ان کے نصاب میں کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔

بعض بڑے مدارس نے البتہ یہ کر لیا ہے کہ طلبہ کو کمپیوٹر مہیا کر دیے ہیں یا انہیں حکومتی ڈگریوں کے لیے تیاری کرنے اور امتحان دینے کی اجازت دے دیتے ہیں (اور بعض اس کی خود تیاری بھی کرا دیتے ہیں)۔ ہماری رائے میں یہ اپنی جگہ خود ایک خطرناک رجحان ہے کیونکہ مغربی علوم تو مغرب کی ملحدانہ تہذیب کی پیداوار ہیں اور زہریلے ہیں لہٰذا زہر نکالے بغیر ان کا استعمال زہر خوارنی کے نتائج لازماً پیدا کرے گا لہٰذا جدید اور عصری علوم کی جب تک اسلامی تشکیل نو نہ کی جائے، ان کا مطالعہ اور تدریس ہرگز ہرگز مفید نہیں لیکن یہ دینی مدارس سمجھتے ہیں کہ اس جھنجھٹ میں کون پڑے! یہ تو حکومتوں کے کام ہیں۔

بہر حال ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے دینی مدارس کا درس نظامی پر جمود کا طرزِ عمل درست نہیں اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی فکر کے بالکل خلاف ہے جنہوں نے درس نظامی اور دیوبند کے نصاب کے ہوتے ہوئے ایک نئے نصاب کی ضرورت محسوس کی اور نہ صرف ضرورت محسوس کی بلکہ نیا نصاب عملاً بنایا اور چلانا چاہا اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا مرتب کردہ نصاب دیوبند، درس نظامی اور دیگر نصابوں سے بہت بہتر ہے جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

۲۔ مقاصد تعلیم

مولانا کی فکری عظمت یہ ہے کہ غلام ہندوستان میں رہتے ہوئے انہوں نے مقاصد تعلیم کو علی منہاج النبوۃ اور علی منہاج السلف قائم کرنے کی تجویز دی اور دیوبند کی طرح اسے صرف محدود مذہبی تعلیم

تک محدود نہیں رکھا۔ دیوبند نے جو نظام تعلیم اپنایا (جو اس کے نصاب سے ظاہر ہے) اس کے پیش نظر ایسے علماء تیار کرنا تھا جو مساجد اور مدارس کو آباد رکھ سکیں اور معاشرے کی مذہبی رسومات (نکاح، طلاق، جنازہ......وغیرہ) بجالا سکیں جب کہ تعلیم کا نبوی اور سلفی منہج یہ ہے کہ ایسا آدمی تیار کیا جائے جو پورے دین کا نمائندہ ہو، جو مسلم معاشرے اور ریاست کے لیے بھی کارآمد ہو۔ ہندوستان میں مسلم ریاست نہ رہی تھی لیکن مسلم معاشرہ تو موجود تھا۔ دیوبند نے (اور اس کے اتباع میں سیکڑوں ہزاروں دینی مدارس نے) جو نظام تعلیم اور نصاب اپنایا اس کا حاصل محدود معنوں میں ایک ’عالم دین‘ یا ایک ’مذہبی آدمی‘ کی تیاری تھا لیکن مولانا مدنیؒ نے جو نصاب بنایا اس کے پیش نظر یہ تھا کہ ایک ایسا متوازن آدمی تیار کیا جائے جو دین کا علم رکھنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کا عام اور مفید کارکن بھی ہو اور یہ بات مولانا کے تجویز کردہ نصاب سے ظاہر ہے جس میں مندرجہ ذیل علوم وفنون شامل ہیں:

خالص مذہبی علوم

قرآن وحدیث، سیرت وسوانح، مناظرہ (تقابل ادیان)

عمرانی علوم (Social Sciences)

لسانیات میں مقامی (بنگلہ، اردو)، مذہبی (عربی، فارسی) اور بین الاقوامی زبانیں (ملیالم، تامل اور خصوصاً انگریزی) زبان شامل تھی بشمول تحریر وتقریر اور ادب وکتابت کے نیز ان میں قانون، (فقہ اور اصول فقہ)، سیاسیات، معاشیات، فلسفہ، منطق، تاریخ، جغرافیہ، ڈرائنگ وغیرہ شامل تھی (اصول وقوانین کلیہ ۹، ۱۱)

سائنسی علوم (Physical Sciences)

حساب (میتھ) الجبرا وجیومیٹری، سائنس، فلکیات (اسٹرانومی) مساحت ونقشہ نویسی (انجینئرنگ) کے علاوہ فنون میں مندرجہ ذیل مہارتیں اور ٹیکنالوجیز شامل تھیں۔ ۱۔ کپڑا بننا اور چرخہ چلانا ۲۔ حدادی (لوہے کا کام) ۳۔ نجاری (بڑھئی کا کام) ۴۔ خیاطت (کپڑا سینا) ۵۔ گھڑی سازی ۶۔ جلد بندی ۷۔ چمڑا رنگنا ۸۔ بوٹ وغیرہ بنانا ۹۔ سونار کا کام وغیرہ بشمول مارشل آرٹس یعنی فن سپاہ گری (اصول وقوانین کلیہ ۱۵)

اس نصابی خاکے سے ظاہر ہے کہ مسلم ریاست نہ ہونے کی وجہ سے مولانا کا نصابی خاکہ ریاستی کارکن (بیوروکریسی) تو تیار نہیں کرتا لیکن وہ ایسا فرد ضرور تیار کرنا چاہتے ہیں جو دینی علوم کے ساتھ دنیاوی مہارتیں بھی رکھتا ہو تاکہ وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد روزگار بھی حاصل کر سکے اور جو معاشی طور پر خود کفیل ہو اور معاشرے کا اہم رکن ہو صرف مسجد کا مولوی صاحب نہ ہو۔ مولانا مدنیؒ کا یہ اصول کوئی معمولی بات نہیں بلکہ

یہ اس سیکولرزم کی جڑ کاٹتا ہے جسے مغرب کی ملحدانہ تہذیب نے عروج پر پہنچا دیا ہے بلکہ عملاً ساری دنیا میں (بشمول مسلم ممالک کے) اسے غالب و نافذ کر دیا ہے اور جسے بدقسمتی سے ہمارے دینی مدارس بھی صرف محدود مذہبی تعلیم دے کر (اور اسے 'پورا دین' قرار دے کر) اور طالب علم کو دنیاوی علوم و مہارتوں سے محروم رکھ کر پروموٹ کر رہے ہیں جس کی وجہ سے معاشرے میں دین و دنیا کی تفریق اور مسٹر و مولوی کا فرق دن بدن گہرا ہوتا جا رہا ہے اور وہ متوازن شخصیت ختم ہو رہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور صحابہ و سلف نے پیدا کر کے دکھائی تھی۔

۳۔ اسکیم آف سٹڈیز

مولانا مدنیؒ نے اپنی تعلیمی اسکیم کو ۱۶ سال پر مبنی قرار دیا ہے۔ مکتب (ابتدائیہ) کے ۳ سال، مدرسہ ثانویہ (جونیئر) ۵ سال اور درجہ عالیہ (سینئر) کے ۸ سال اور اس کے بعد درجۂ تکمیل۔

ان تین مراحل کو وہ اصول فقہ میں مقاصد شریعت کی اہمیت کی طرز پر ضروریات، حاجیات اور تحسینیات کی طرح شمار کرتے ہیں کہ مرحلہ اول یعنی مکتب کی حیثیت 'ضروریات' جیسی ہے کیونکہ اس میں ضروریات دین (حلال و حرام اور اوامر و نواہی کا علم، قرآن پڑھنا، نوشت و خواند وغیرہ) کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مولانا کے الفاظ میں 'اس میں وہ فنون اور کتب و اعمال رکھے گئے ہیں جو ہر مسلمان کے لیے بحیثیت مذہب و انسانیت ضروری ہیں' (اصول و قوانین کلیہ ۵)۔

مرحلہ ثانویہ (جونیئر) کے بارے میں کہتے ہیں کہ 'اس درجہ میں ان علوم و فنون والسنہ و کتب وغیرہ کو تجویز کیا گیا ہے جو کہ مذہبی و دنیاوی زندگی کی ضروری آسانیاں پیدا کرنے والے ہیں۔ اسی طرح مرحلہ ثالثہ کی حیثیت تحسینیات جیسی ہے اور تخصص کے مرحلہ کو وہ بطور مکملات المصالح یعنی 'تکمیل کے درجات' قرار دیتے ہیں (اصول و قوانین ۲۴)۔

مولانا نے تعلیمی کیلنڈر اور تقسیم اوقات کا بھی بخوبی خیال رکھا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ 'تدریس کا ابتدائی سال نصف ماہ شوال سے شروع ہوگا اور انتہاء نصف شعبان پر ہوگی' اور 'سال بھر میں تقریباً ساڑھے سات مہینے تعلیم میں خرچ ہوں گے یعنی سالانہ تعطیل، ہفتہ وار تعطیل اور ایام امتحان کو منہا کر دینے کے بعد جو زمانہ بچتا ہے وہ تعلیم کا خاص زمانہ ہے' (اصول و قوانین ۲۶)

وہ مزید فرماتے ہیں کہ روزانہ تدریس چھ گھنٹے ہوگی مگر ہر گھنٹہ پچاس منٹ کا شمار کیا جائے گا۔ تدریس ہمیشہ دس بجے سے لے کر چار بجے تک ہوا کرے گی (تاہم اسے حسب ضرورت مقدم و موخر کیا جا سکتا ہے)۔ ابتدائی مرحلے میں داخلے کی عمر ۵ سال ہوگی اور ابتدائی سال میں تعلیم فقط چار گھنٹے دی

جائے گی جب کہ مرحلہ ثانویہ میں مولانا نے مقدار تعلیم ۳۶ گھنٹہ فی ہفتہ مقرر کی ہے۔ دوران سال تعطیل مولاناؒ نے صرف ۸ دن تجویز کی ہے یعنی ٦ دن عیدالاضحیٰ کے اور دو دن عاشورہ کے۔ **(جاری ہے)**

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

پاکستان میں تعلیم کی آئینی اساس

پاکستان میں تعلیم کی آئینی اساس پر کچھ کہنا یا کچھ لکھنا عجیب لگتا ہے کیونکہ موجودہ صورتِ حال میں تعلیم اور آئین دونوں عنقا معلوم ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی ادارے کھلے ہیں۔ کتابیں بھی شاید جزواً پڑھائی جارہی ہیں۔ جیسے کیسے امتحان بھی ہو رہے ہیں۔ سندیں اور ڈگریاں بھی عطا کی جارہی ہیں لیکن تعلیم؟ اس کا کوئی وجود نظر نہیں آتا۔ تعلیم جو انسان کو انسانِ مطلوب بناتی ہے، مسلمان اور پاکستانی بناتی ہے وہ ناپید ہے۔ رہ گیا آئین تو یہ بیچارہ گھرا ہوا ہے تماش بینوں میں جب کہ اسے تماشا بنانے والے اونچی مسندوں پر براجمان اور ہر طرح کی جوابدہی سے استثنا کے دعویدار ہیں۔ ایسے ماحول میں تعلیم کی آئینی اساس پر کچھ کہنا لکھنا عجیب ہی تو لگے گا لیکن دنیا برامید قائم۔ کبھی تو وہ سورج طلوع ہوگا جس کی روشنی میں آئین اپنی چمک دمک دکھائے گا اور اس چمک دمک میں تعلیم روشنی پھیلانے کے قابل ہو جائے گی۔ ڈگریاں اور سندیں اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرلیں گی اور خدا کے مطلوب بندوں کی ایک کھیپ تیار ہو جائے گی جو چارسُو محبت، امن، وقار اور ترقی کا باعث بنیں گے۔

تعلیم کی آئینی اساس کے موضوع پر آگے بڑھنے سے پیشتر ہم جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی اساس کیا ہے۔ ہماری قطعی رائے میں پاکستان کے آئین کی اساس قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہؐ ہے۔ یہ دعوی کوئی ہم اپنی طرف سے نہیں کررہے ہے بلکہ:

☆ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے متعدد بیانات اور تقاریر اس کی شاہد ہیں۔

☆ پاکستان کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے۔

☆ قرار دادِ مقاصد جب پاس ہوئی تو اس وقت دستور ساز اسمبلی میں بانیانِ پاکستان کی تقاریر خصوصاً وزیراعظم لیاقت علی خان کا خطاب اس دعوی کی تائید کرتا ہے۔

اب اگر کچھ تاجی، پاجی اور ناجی قسم کے مفسد اپنی جہالت اور تعصب کی بنا پر اسے متنازع بناتے ہیں تو ان کی کوئی اخلاقی، قانونی اور تاریخی حیثیت نہیں ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستان کا آئین قرآنِ مجید کی تعلیمات اور سنتِ رسول اللہ کے تقاضوں کو درست طور پر پورا کرتا ہے؟

یہ ایک الگ سوال ہے جس پر مختلف آراء ہوسکتی ہیں لیکن بنیادی دعوی پر کوئی اختلاف نہیں ہے نیز آئین کے معماروں نے قرآن وسنت کو آئین میں سمونے کی اپنی سی کوشش کی ہے جسے وقت کے ساتھ بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ایک اور پہلو جس کی طرف توجہ بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ:

☆ آئین اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ ریاست کا مذہب اسلام ہوگا۔

☆ جس طرح جب کوئی فرد یہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں تو قرآن کریم کی تمام تعلیمات اور سنتِ رسول اللہؐ کے تمام تقاضے اس کی زندگی پر لاگو ہوجاتے ہیں۔

بالکل اسی طرح جب ریاست اعلان کرتی ہے کہ اسلام اس کا مذہب ہے تو قرآن مجید کی تمام تعلیمات اور سنتِ رسول اللہؐ کے تمام تقاضے اس ریاست اور ریاست کے اجزاء اور افراد پر قانوناً لاگو ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے اپنے ایک حالیہ فیصلے میں واضح طور پر قرار دیا ہے کہ پورے کا پورا قرآن اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کا حصہ ہے۔

ہم ذرا یہاں ریاست کی آئینی تشریح بھی اپنے قارئین کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

آئین کے آرٹیکل 7 (سات) کے مطابق وفاقی اور صوبائی حکومتیں، مجلسِ شوریٰ یعنی قومی اسمبلی اور سینٹ، صوبائی اسمبلیاں اور ہر وہ نظم جو قانون کے مطابق عوام سے ٹیکس وصول کرنے کا مجاز ہے وہ ریاست کے اعضاوجوارح میں شامل ہے۔

آئین اور ریاست کے متعلق بنیادی نکات واضح کرنے کے بعد آیئے دیکھتے ہیں کہ نظامِ تعلیم کا مآخذ یا اساس کیا ہوگی۔

کرۂ ارض کی تمام اقوام کے نظام ہائے تعلیم کا مطالعہ کیا جائے تو نظامِ تعلیم کے جو ماخذ سامنے آتے ہیں اُن کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

☆ انسان کی زندگی (یا تخلیق) کا بنیادی مقصد

☆ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو منظم کرنے والا ریاستی آئین

☆ عصری مادی تقاضے

اب ہم آتے ہیں پاکستان کے نظامِ تعلیم کی طرف جس کے لیے درج ذیل نکات قابلِ غور ہیں:

☆ پاکستان مسلمانوں کی اکثریت والا ملک ہے۔

☆ قرآن حکیم کے مطابق انسان کا مقصدِ زندگی یا مقصدِ تخلیق اللہ کی عبادت ہے۔

☆ ریاستِ پاکستان کا مذہب اسلام ہے۔

☆ قرآن وسنت آئین کے بنیادی ماخذ ہیں۔

☆ سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلے کے مطابق پورا قرآن مجید پاکستان کے آئین کا حصہ ہے۔

☆ پاکستان کو سائنسی، صنعتی، معاشی اور دفاعی طور پر دنیا کا صفِ اول کا ملک ہونا چاہیے۔

سطورِ بالا میں بیان کیے گئے نکات پاکستان میں تعلیمی پالیسی، نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کی ایک واضح بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اب آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں آئینِ پاکستان تعلیم اور نظامِ تعلیم کے بارے میں ریاست کی کیا کیا ذمہ داریاں طے کرتا ہے۔

سب سے پہلے قراردادِ مقاصد لیتے ہیں جس میں ریاست کی یہ ذمہ داری لگائی گئی ہے کہ وہ پاکستان کے عوام کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے مطابق گزاریں جیسا کہ قرآن وسنت میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قراردادِ مقاصد کے اس تقاضے کو زیادہ تفصیل کے ساتھ آئین کے آرٹیکل 31 میں سمویا گیا ہے جس کے مطابق پاکستان کے عوام کو تعلیم کے ذریعے اس قابل بنانا کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے مطابق گزار سکیں جیسا کہ قرآن وسنت میں بیان کیا گیا ہے نیز اس آرٹیکل کے تحت مسلمانوں کے لیے قرآن کی تعلیم اور عربی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔

اس کے علاوہ آئین کے ارٹیکل 20، 22، 37، 25/A، 38 ڈی اور آرٹیکل 40 میں بلا امتیاز سب کے لیے تعلیم کے مساوی مواقع، تعلیم سب کے لیے، 5 سال کی عمر سے 16 سال کی عمر تک لازمی

تعلیم، میٹرک تک لازمی اور مفت تعلیم، ٹیکنیکل اور پروفیشنل ایجوکیشن کی عمومی فراہمی نیز اعلیٰ تعلیم کی میرٹ پر بلا امتیاز مساویانہ بنیادوں پر سب کو فراہمی شامل ہے۔ تعلیم کی فراہمی میں ہر طرح کے امتیاز کی ممانعت کی گئی ہے۔

آئین اور قرآن وسنت کی واضح ہدایات کی روشنی میں تعلیم کے حوالے سے جو پالیسی نکات سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہیں:

☆ تعلیم کا حصول تمام مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں پر فرض ہے۔

☆ تعلیم کا حصول کوئی وقتی تقاضا نہیں ہے بلکہ یہ زندگی بھر کا جاریہ عمل ہے۔ اسے ہم اصطلاحاً تعلیمِ مسلسل (Continuing Education) کہتے ہیں۔

☆ بنیادی تعلیم مفت اور لازمی ہے جس کی ذمہ داری ریاست پر ہے۔

☆ قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق عوام کو زندگی گزارنے کے اہل بنانا ریاست کی ذمہ داری ہے اور یہ تعلیم اور نصابِ تعلیم کا بنیادی جزو ہوگا۔

☆ قرآن مجید اور عربی زبان کی تدریس لازمی ہوگی۔

☆ ٹیکنیکل اور پروفیشنل ایجوکیشن ضرورت کے مطابق ہر شہری کا حق ہے جب کہ ہائیر ایجوکیشن ضرورت اور اہلیت کے مطابق ہر شہری کو بلا امتیاز اور میرٹ پر ریاست مہیا کرے گی۔

☆ تعلیم کے حصول میں سب شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے اور اس سلسلہ میں کسی طرح کا امتیاز جائز نہیں ہوگا۔

☆ کسی ایک مذہب کی تعلیم دوسرے مذہب کے ماننے والے طلبا کو جبراً نہیں دی جائے گی۔

☆ مختلف مذاہب کے لوگوں کو اپنے اپنے تعلیمی ادارے کھولنے کی آزادی ہوگی۔

☆ اردو قومی زبان ہوگی اور اس طرح وہ تعلیم اور دفاتر میں رائج ہوگی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آئینِ پاکستان اور قرآن وسنت کے مذکورہ بالا تقاضے کیا حکومتِ پاکستان، جو پاکستانی ریاست کی نمائندگی کرتی ہے، پورے کر رہی ہے؟

ہم سب جانتے ہیں کہ جواب اگر مکمل نفی میں نہیں تو جزوی طور پر نفی میں ضرور ہے اور یہ جزوی نفی کل کا سب سے بڑا جزو ہے۔ حکومت نے پالیسی سطح پر کچھ اقدامات کیے بھی ہیں تو یا تو وہ سطحی اور ناکافی ہیں یا شرمندۂ نفاذ نہیں ہو سکے۔

اگر ہم موجودہ تعلیمی صورتِ حال کو مختصراً بیان کرنا چاہیں تو اس کے لیے مندرجہ ذیل چار الفاظ کافی ہیں:

1۔لبرالائیزڈ (Liberalized) 2۔ویسٹرنائیزڈ (Westernized)

3۔سیکولرائیزڈ (Secularized 4۔کمرشلائیزڈ (Commercialized)

نیز پرائیوٹ تعلیمی اداروں کے لیے ایک اور لفظ کا اضافہ کیا جاسکتا ہے اور وہ ہے گلیمرائیزڈ (Glamourized)

پرائیوٹ تعلیمی اداروں میں سے اکثریت اپنی پبلسٹی گلیمر کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں بتاتے کہ اُن کے ہاں معیارِ تعلیم وتربیت کیا ہے بلکہ اس امر کو نمایاں کرتے ہیں کہ اُن کے ہاں میوزیکل کنسرٹ ہوتے ہیں، اُچھل کود کی محفلیں ہوتی ہیں، مخلوط سیر سپاٹے کرائے جاتے ہیں۔ اخبارات کے پورے پورے صفحات اچھل کود کی تصویروں سے مزّین ہوتے ہیں۔فرنٹ آفس میں پری چہرے پوری آب و تاب کے ساتھ بٹھائے جاتے ہیں جو داخلے کے لیے آنے والے نوجوانوں کو ڈیل کرتے ہیں۔

نتیجہ کیا ہے؟

نتیجہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارنے کے اہل بنانے کی بجائے مغرب زدہ سیکولر کلچر پروان چڑھ رہا ہے، اسلامی ثقافت کی جڑیں اُکھڑ رہی ہیں، اخلاق تباہ ہو رہے ہیں، معیارِ تعلیم تحت الثری کو چھو رہا ہے، تعلیمی ناانصافیاں تمام حدیں پھلانگ چکی ہیں اور طبقاتیت کو فروغ مل رہا ہے۔ زیریں اور متوسط طبقے میں کرپشن کی سب سے بڑی وجہ آئین سے باغی موجودہ طبقاتی نظامِ تعلیم ہے کیونکہ ہر ماں باپ اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ فیسوں والے سکولوں اور کالجوں میں داخل کرانا چاہتا ہے اور اس کے لیے ہر جائز ناجائز طریقے سے پیسے اکٹھے کرنے کے لیے سرگرداں ہے۔

کیا ملک میں کوئی تعلیمی پالیسی کارفرما ہے؟

اس ملک میں آئین بھی ہے۔آئین کے تعلیمی تقاضے بھی سر اُٹھا کر کھڑے ہیں۔قرآن وسنت کی روشنی میں اخلاص عمل کے دعوے بھی موجود ہیں اور قرآن وسنت کے تعلیمی تقاضے بھی اکثر لوگوں کو ازبر یاد ہیں لیکن کوئی مربوط تعلیمی پالیسی، واضح تعلیمی لائحہ عمل اور منحرفین کو صراطِ مستقیم پر رکھنے والا تعلیمی قانون اگر کہیں ہے تو روبہ عمل نہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کا شعبہ سب کے لیے ایک آزاد چراگاہ بن چکا ہے یعنی تعلیم کا شعبہ فری فار آل ہے۔کسی پر کوئی قدغن نہیں۔جو چاہو کرو۔جیسا چاہو نصاب لگاؤ۔جہاں سے چاہو امتحان دلاؤ اور جیسا چاہو سسٹم نافذ کرو۔

اس ساری صورتِ حال کا ذمہ دار کون ہے؟

اس ساری صورتِ حال کی ذمہ دار ماضی کی بُری حکومتیں اور موجودہ بُری حکومت ہے۔ یہ بات ہم ایک دفعہ پھر دہراتے ہیں کہ اس صورتِ حال کی ذمہ دار ماضی کی بُری حکومتیں اور موجودہ بُری حکومت ہے لیکن :

اگر سچی بات کی جائے تو

تو تعلیم کی موجودہ بُری صورتِ حال کی ذمہ دار صرف بُری حکومتیں نہیں ہیں۔ ہم بھی اس کے ذمہ دار ہیں اور ''ہم'' سے ہماری یہاں مراد اساتذہ کرام، دینی سیاسی جماعتیں، حبِ وطن اور دین کی سربلندی کے جذبے سے سرشار ایسے ہزاروں لوگ جو پرائیویٹ تعلیمی ادارے چلا رہے ہیں۔

دینی طبقات میں سے اُن بلند عزم لوگوں پر غور فرمائیں جنہوں نے :

اسراء یونیورسٹی، منہاج یونیورسٹی، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، شفاء یونیورسٹی، قرطبہ یونیورسٹی، یونیورسٹی آف لاہور، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی، لیڈز یونیورسٹی، ہمدرد یونیورسٹی اور شاید اس طرح کی دو چار اور یونیورسٹیاں بھی قائم کی ہیں۔

جیسا کہ قبل ازیں کہا گیا کہ تعلیم کا شعبہ فری فار آل ہے۔ یہ بیکن ہاؤس یونیورسٹی، ہجویری یونیورسٹی اور اقراء یونیورسٹی کے لیے فری فار آل ہے تو اوپر بیان کی گئی یونیورسٹیاں جو اسلامی ذہن کے لوگوں کے زیرِ اہتمام چل رہی ہیں ان کے لیے بھی سب کچھ فری فار آل ہے۔ ان یونیورسٹیوں کو کس نے ڈکٹیشن دی ہوئی ہے کہ وہ بھی اسی طرح لبرل، اور مغرب زدہ ماحول اپنے طلبہ کو دیں جو لبرل کہلانے والی یونیورسٹیاں دیتی ہیں۔ مذکورہ یونیورسٹیوں کو کس نے روک رکھا ہے کہ سوشل سائنسز، مینجمنٹ سائنسز اور فنانشل سائنسز میں اسلامی نقطہ نگاہ سے ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ کا کام نہ کریں۔ دنیا میں تبدیلی علم کے ذریعے سے آتی ہے اور علم کی تدوین، ترویج اور ترقی یونیورسٹیاں کرتی ہیں۔ اگر مذکورہ دس بارہ یونیورسٹیاں صحیح خطوط پر کام کریں تو اس ملک میں دس بارہ سالوں میں قابلِ لحاظ تبدیلی آ سکتی ہے۔

یونیورسٹیوں کے ساتھ ہم اگر اُن سکولوں پر بھی نظر ڈال لیں جو دینی شہسواروں نے 'قرآن اور کمپیوٹر کی تعلیم ساتھ ساتھ' کے سلوگن کے تحت قائم کیے ہیں تو ہمارا درد اور تشویش مزید واضح ہو جائے گی۔ ان سکولوں میں چند ایک معروف سکول سسٹمز حرا سکولز، دعوۃ ماڈل سکولز، منہاج ماڈل سکولز، اقراء سکولز، فاران سکولز، یقین ماڈل سکولز، قیادت سکولز، ہلال سکولز، دارِ ارقم سکولز، پنجاب سکولز، غزالی سکولز اور نالج سکولز شامل ہیں۔ ان سکول سسٹمز کے ساتھ دینی ذہن رکھنے والے افراد کے ہزاروں انفرادی سکول بھی شامل کریں تو مذکورہ اداروں میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد بلاشبہ لاکھوں میں ہے۔ مذکورہ اداروں میں

بیکن ہاؤس سکولز، سٹی سکولز، شوئفات سکول، دی ایجوکیٹرز اور الائیڈ سکولز کی نسبت شاید شر تو کم ہو لیکن کیا خیر کی مقدار بھی نمایاں ہے؟ یہ کہنا مشکل ہے۔

اسلام اور نظریہ پاکستان کا دعوٰی کرنے والے یہ ہزاروں سکول جو لاکھوں طلبہ کو تعلیم دے رہے ہیں اگر قرار دادِ مقاصد اور آئین کے آرٹیکل 31 کے مطابق اسلامی تربیت کا بھی اہتمام کر لیں اور اپنے طلبہ کو قرآن و سنت کے مطابق زندگی گزارنے کے اہل بنا دیں تو ان شاء اللہ اس ملک میں تبدیلی آنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگے گا لیکن ان سکولوں کی پشت پر کھڑے دینی ذہن کے لوگ اور جماعتیں ہزاروں سال بھی ریلیاں نکالتی رہیں، جلسے جلوس کرتی رہیں اور مطالبات پر مبنی قرار دادیں پاس کرتی رہیں تو کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ حقیقی تبدیلی، ذہنی تبدیلی، فکری تبدیلی ہوتی ہے اور اس نوع کی تبدیلی صرف تعلیم کے ذریعے آ سکتی ہے جب کہ تعلیم و تربیت کا پلیٹ فارم مذکورہ بالا ہزاروں سکولوں کے ہاتھوں میں ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا محب پاکستان اور محب اسلام طبقات اپنے اپنے پرائیویٹ تعلیمی اداروں سے مال کمانے کے علاوہ کوئی دینی، قومی خدمت بھی سرانجام دے رہے ہیں؟ اس پر بات نہ ہی کی جائے تو بہتر ہے۔

آخری سوال یہ کہ کیا کیا جائے؟

☆ تعلیم کا مسئلہ قرار دادوں اور مطالبوں سے حل نہیں ہو گا۔ اس کے لیے محب وطن اور محب اسلام حلقوں کو عملی اقدامات کرنا ہوں گے۔

☆ حکومت اور حکومتی اعضا و جوارح پر دباؤ قائم رکھا جائے۔

☆ آئین اور قرآن و سنت کی روشنی میں تعلیمی ایشوز پر رٹ پٹشنز دائر کی جائیں۔ امریکہ جیسے ملک میں بھی تعلیم کے شعبہ میں زیادہ تر تبدیلیاں کورٹس کے ذریعے آئی ہیں۔

☆ محب وطن اور محب اسلام طبقات نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں انہیں ایک تحریک کے ذریعے راغب کیا جائے کہ وہ آئینِ پاکستان اور قرآن و سنت کے تقاضوں کو اپنے اداروں کے لیے عملاً راہنما بنائیں۔

☆ ماڈلز تخلیق کیے جائیں۔ جس معاشرے میں تعلیم کا شعبہ فری فار آل ہو وہاں اس آزادی کو کام میں لا کر ماڈل تخلیق کرنا آسان ہوتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس میں کمائی نہیں خرچ ہو گا۔ یہ کون کرے گا اور کیسے ہو گا؟ یہ سب کچھ میں مکرم و محترم قاضی حسین احمد کی خدمت میں ایک التجاء کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

☆ ملی یک جہتی کونسل نے حال ہی میں مفید پیش رفت کی ہے۔ کیا ہم اس کے تعلیمی کمیشن سے

کوئی مثبت امیدیں باندھ سکتے ہیں؟

☆ اسلام نے خطبہ جمعہ کی شکل میں تعلیمِ مسلسل کا جو نظام دیا ہے وہ فرقہ واریت زدہ خطبا حضرات کی وجہ سے بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ ملی یک جہتی کونسل نے اس ایشو پر بھی کمیشن تشکیل دیا ہے۔ ہم دُعا ہی کر سکتے ہیں کہ علماءِ کرام و خطباءِ عظام کے دلوں میں اللہ کا خوف اور آخرت کی جواب دہی کا احساس پیدا ہو کیونکہ خطبہ ہائے جمعہ کو مؤثر بنا کر بھی ملتِ اسلامیہ پاکستان کی تعلیم و تربیت کی جا سکتی ہے۔

اسلام اور مغربی تہذیب

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

مسلم معاشرے پر سیکولرزم کے اثرات

مسلم معاشرے میں اسلام اور مغربیت کی کشمکش

پچھلی ڈیڑھ صدی میں مسلم معاشرے میں تعلیم اور تمدن و ثقافت کی کیفیت بھی روبہ زوال رہی ہے۔ تمدن اور ثقافت دراصل تعلیم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ معاشرے میں جو سطح تعلیم کی ہوگی وہی سطح تہذیب و تمدن کی ہوگی۔ یقیناً تہذیبی ترقی و تمدنی ترقی میں مادی وسائل کی اہمیت ہوتی ہے لیکن مادی وسائل کی حیثیت ثانوی ہے۔ اوّلین حیثیت تہذیب و تمدن کے باب میں تعلیم اور افکار کو حاصل ہوتی ہے۔ تبدیلی جو بھی پیدا ہوتی ہے وہ سب سے پہلے لوگوں کے دل و دماغ میں پیدا ہوتی ہے۔ جہانِ تازہ کی نمود افکار تازہ سے ہوتی ہے، سنگ و خشت سے نہیں۔ اس لیے جیسے جیسے مغرب سے یہ نئے افکار آتے گئے، وہ تعلیم و تمدن پر بھی اثر انداز ہوتے گئے، عامۃ الناس کے افکار کو بھی انہوں نے متاثر کیا۔

دوسری طرف تعلیم کا جو عمومی نظام تھا، جو ابھی تک علماء کرام کے ہاتھ میں تھا، اس میں کسی تبدیلی یا کسی ترمیم کی ضرورت علماء کرام نے محسوس نہیں کی۔ ابھی تک قدیم اور ازکاررفتہ یونانی منطق اور فلسفہ ہی نظامِ تعلیم کی جان اور مان سمجھا جاتا تھا۔ ان موضوعات کے بارہ میں بھی متاخرین کی کتابیں اور ان کے حواشی اور شرحوں اور خلاصوں پر ہی علم و فن کا سارا دارومدار چلا آتا تھا۔ اس قدیم منطق اور فلسفے کے بارے میں ہر صاحب علم رطب اللسان نظر آتا تھا، وہ منطق اور فلسفہ جو یونان سے چلا آرہا تھا۔ جس کی بنیاد پر نہ سائنس کی ترقی ہو سکتی تھی، نہ تعلیم کی ترقی ہو سکتی تھی، نہ بقیہ اجتماعی اور انسانی علوم و فنون ترقی پا سکتے تھے۔ جس کو اہل یورپ نے طویل عرصہ ہوئے چھوڑ دیا تھا۔ وہاں سائنس اور فلسفہ نئے نئے انداز میں کام کر رہا تھا۔ سائنسی ترقیات نے نئے نئے نمونے اور کامیابیوں کی مثالیں قائم کر دی تھیں۔ اس سے

استفادہ کرنے کے لیے دنیائے اسلام نے کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بلکہ اس دور میں یعنی دورِ زوال کے آخری زمانہ میں قدیم منطق، قدیم فلسفہ، اور قدیم طبیعیات کے نام پر جو سرمایہ چلا آرہا تھا وہ مسلمانوں میں جوں کا توں جاری رہا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سے بڑی تعداد کا تعلق اسی فکری بیابان اور علمی ویرانے سے تھا، جو فلسفہ کے نام سے مسلمانوں میں جاری تھا۔ دینی درسگاہوں میں یہ بحث قاہرہ میں بھی ہورہی تھی، استنبول میں بھی ہورہی تھی اور ہندوستان میں بھی ہورہی تھی کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے اور زمین مدار کائنات ہے اور کائنات کے تمام سیارے بشمول سورج اس کے گرد گردش کررہے ہیں۔ کسی غلط فہمی کے نتیجے میں اس کو قرآن پاک کا منشاء بھی بعض لوگوں نے سمجھ لیا اور یوں یہ بات غلط طور پر عقیدے کا حصہ بھی بن گئی۔ بعض لوگوں کی نظر میں یہ سب امور دین کا حصہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ قیادت اور راہنمائی کے منصب سے علمائے دین اور فقہائے امت وقتاً فوقتاً اور آہستہ آہستہ ہٹتے گئے اور عملاً قیادت اور رہنمائی کا منصب اس طبقے کے ہاتھ میں آتا گیا جو مغربی افکار سے متاثر تھا، اور مغربی تعلیم کے نتیجے میں تیار ہوا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دنیائے اسلام گزشتہ دوسو سال سے ایک ایسے شدید معرکے سے دوچار ہے جس میں ایک طرف عامۃ الناس یعنی مسلمانوں کی وہ غالب ترین اکثریت ہے، جو اسلام پر کاربند ہے، شریعت پر عمل پیرا ہے، جزوی طور پر شریعت کے احکام کی پابند ہے اور جس کے افکار اور نظریات بڑی حد تک مسلمانوں کی روایات کے غماز ہیں نیز جس کی تمنائیں، جس کی آرزوئیں ہر جگہ مشترک ہیں اور جو اسلامی تہذیب کے احیاء کا ایک خاص تصور مستقبل کے حوالے سے رکھتے ہیں۔ یہ طبقہ ایک طرف ہے۔ دوسری طرف حکمران اور بااثر طبقہ ہے، جس کی بڑی تعداد نہ صرف مغربی تصورات رکھتی ہے بلکہ مغربی تصورات کو فروغ دینے میں دن بدن کوشاں ہے۔ یہ حکمران اور بااثر اقلیت زندگی کے جملہ معاملات کو عموماً اہل مغرب کے نقطہ نظر سے دیکھتی ہے۔ جس کے نزدیک علم وہ ہے جو مغرب میں ہے۔ تعلیم وہ ہے جو مغربی جامعات میں ہے۔ تہذیب وتمدن وہ ہے جو دنیا کے مغربی ممالک میں ہے۔ اس طبقے کے نزدیک دنیائے اسلام کے مستقبل کا دارومدار اس پر ہے کہ مشرق کی ہر قدیم روایت کو ختم کرکے مغرب کے تمام تصورات کو جوں کا توں قبول کرلیا جائے۔ مصطفی کمال نے یہی نسخہ آزمایا، رقیبہ نے بھی یہی نسخہ آزمانا چاہا، البانیہ میں یہی نسخہ آزمایا گیا، دنیائے اسلام کے متعدد ملکوں میں اس نسخے پر عمل درآمد ہوا۔ لیکن نتیجہ سوائے اس کشمکش کو شدید تر بنانے کے اور کچھ نہیں نکلا۔ عامۃ الناس کی غالب ترین اکثریت نے اس نسخہ کو قبول نہیں کیا۔ حکمرانوں نے عامۃ الناس کے ذہن اور مزاج کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں یہ کشمکش وقت کے ساتھ تیز سے تیز تر ہوتی چلی جارہی ہے۔

یہ دو طبقے جب سے الگ الگ وجود میں آئے ہیں، ان کے درمیان خلیج روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور وسیع سے وسیع ہوتی چلی جارہی ہے، اس وقت سے دنیائے اسلام پر سیکولرازم کا غلبہ بھی بڑھتا چلا جارہا ہے۔ سیکولرازم یہ ہے کہ دینی و مذہبی تعلیمات کو اجتماعی زندگی سے نکال دیا جائے۔ قانون، سیاست، معیشت اور معاشرت کا مذہبی تعلیم اور دینی رہنمائی سے کچھ تعلق نہ ہو۔ یہ تصور اہل مغرب میں آج سے چار ساڑھے چار سو سال پہلے پیدا ہوا۔ کیوں پیدا ہوا؟ اس پر دنیائے اسلام میں کسی نے غور نہیں کیا۔ پاکستان میں بھی غور نہیں ہوا۔ پاکستان کا حکمران طبقہ بھی اس مسئلے کو سمجھنا نہیں چاہتا۔ علامہ اقبال نے جس خطبے میں پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ اسی خطبے میں یہ بحث بھی کی تھی کہ مغرب میں اصلاح مذہب اور سیکولرازم کا یہ تصور کیوں پیدا ہوا۔ اور دنیائے اسلام میں یہ کیوں پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ غالباً علامہ اقبال یہ سمجھ رہے تھے کہ آئندہ جب وہ ریاست وجود میں آئے گی جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں تو اس ریاست میں یہ سوالات پیدا ہوں گے۔ اس لیے اپنی زندگی کے اس انتہائی اہم خطبہ میں پہلے انہوں نے ان سوالات کا جواب دیا۔ اس کے بعد ایک الگ ریاست کی تجویز پر گفتگو کی۔

سیکولرازم دنیائے اسلام میں سب سے پہلے ترکی میں آیا۔ ترکی میں زمین اس کے لیے سازگار تھی۔ چنانچہ بہت آسانی سے اسلامی قوانین کو ایک ایک کر کے منسوخ کیا گیا۔ مصطفی کمال نے سب سے پہلے اسلامی تعلیمی ادارے بند کیے، دینی تربیت کے ادارے ختم کیے۔ اوقاف کو سرکاری ملکیت میں لے کر ختم کر دیا اور ایک ایک کر کے ان تمام تہذیبی مظاہر کا نام ونشان مٹا دینے کی کوشش کی جو ترکی کی اسلامی حیثیت کو نمایاں کرتے تھے۔ جب ترکی میں سیکولرازم کے اثرات بڑھنا شروع ہوئے اور یہ پہلی جنگ عظیم سے بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ تنظیمات کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ ترک قومیت کا تصور بھی نمایاں ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دینی تعلیم کو سیاست اور معیشت سے، حکومت اور قانون کے ایوانوں سے نکالا جائے گا تو امت مسلمہ کا وہ تصور جو مختلف نسلوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو یکجا کرتا ہے، وہ آپ سے آپ کمزور پڑ جائے گا۔ جیسے جیسے سیکولر نظریات کو فروغ ہوتا جائے گا، ملت اسلامیہ کا نقطۂ جامعہ ختم ہوتا جائے گا۔ وہ نقطۂ جامعہ جس کی بنیاد پر امت مسلمہ کی وحدت قائم ہے۔

امت مسلمہ کیا ہے؟ امت مسلمہ ایک دینی پیغام کی علمبردار وہ بین الانسانی جماعت ہے جو اس پیغام پر ایمان بھی رکھتی ہو اور عمل بھی کرتی ہو، جس پر قبل ازیں ایک خطبے میں تفصیل سے بات ہوئی ہے۔ اگر دین کی وہ حیثیت ختم کر دی جائے، جو معاشرہ اور اجتماع کو جامعیت فراہم کرتی ہے تو امت مسلمہ کا تصور آپ سے آپ ختم ہو جائے گا۔ جب امت مسلمہ کا تصور ترکی میں کمزور پڑا تو وہ نقطۂ جامعہ ختم ہو گیا،

جس نے خلافت عثمانیہ کے باشندوں کو متحد کر رکھا تھا۔ اب ایک نئے نقطۂ جامعہ کی ضرورت پیش آئی۔ آخر ایک نقطۂ جامعہ کی ضرورت تو تھی۔ وہ نقطۂ جامعہ ترکی نیشنل ازم کے ذریعے فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط سے ایسے ایسے ادیب اور شاعر ترکی میں پیدا ہونے شروع ہو گئے، جو ترک نیشنل ازم کے علمبردار تھے۔ ضیاء گوکلپ، مشہور شاعر جس کے علامہ اقبال نے بھی حوالے دیے ہیں، ترکی نیشنل ازم کے فکری مؤسسین میں سے مانا جاتا ہے۔ اس کے ہاں ترک قومیت کی یہ لے بہت بلند آہنگ ہے۔ ضیاء نے ان تمام ترک مفکرین کے پیغام کو اپنے کلام میں پوری طرح سمویا ہے جو اس سے قبل ذرا دھیمے سروں میں ترک نیشنل ازم کی بات کرتے تھے۔ اور جنہوں نے ترک نیشنل ازم کے فروغ میں اس سے پہلے حصہ لیا تھا۔

جب ترک نیشنل ازم اچھی طرح پھلنے پھولنے لگا تو سلطنت عثمانیہ کے عرب علاقوں سے ترکوں کی دلچسپی کمزور ہوئی۔ جب یہ دلچسپی کمزور ہوئی تو مغربی طاقتوں کو بھی موقع ملا، مغربی طاقتوں نے ایک ایک کر کے دنیائے اسلام کے عرب علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کے مفاد میں بھی تھا کہ یہاں عرب نیشنل ازم فروغ پائے۔ عرب نیشنل ازم کے فروغ سے فوری ہدف یہ حاصل ہوتا تھا کہ ان کے قبضے کو جواز ملتا تھا۔ عثمانیوں سے تعلق ختم ہوتا تھا، امت مسلمہ سے تعلق کمزور پڑتا تھا، امت مسلمہ کا تصور فنا ہوتا تھا۔ اس لیے عرب قومیت کے جذبات کو فروغ دیا گیا۔ دنیائے اسلام میں جو قوتیں مغربی طاقتوں کی کاسہ لیس تھیں انہوں نے بھی عرب نیشنل ازم کو فروغ دینے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ یہ عرب نیشنل ازم عرب اقوام کی محبت میں شروع نہیں ہوا تھا، یہ مسلمانوں اور خود عربوں کی وحدت ملی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے تھا۔ یہ سلطنت عثمانیہ کو ختم کرنے کے لیے تھا۔ یہ امت مسلمہ کی وحدت اور بین الاقوامیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے تھا۔ چنانچہ اس کے یہ نتائج بہت جلد ظاہر ہونے لگے اور بہت جلد اپنی اصل صورت میں سامنے آ گئے۔

ترک نیشنل ازم اور سیکولرازم کا یوں تو معاشرہ کے ہر طبقے پر اثر ہوا۔ زندگی کے ہر گوشے میں اس کے اثرات پیدا ہوئے لیکن اس کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی نکلا کہ دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں عربی رسم الخط کو ختم کرنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس کے مقابلے میں رومن رسم الخط کو رواج دینے کی بات ہر جگہ کی جانے لگی۔ سب سے پہلے ترکی میں رسم الخط بدلا گیا۔ اور عربی رسم الخط کے بجائے جس میں ترکی زبان گزشتہ ایک ہزار سال سے لکھی جا رہی تھی، رومن رسم الخط اختیار کر لیا گیا۔ اور یوں بیک جنبش قلم پوری ترک قوم جاہل قرار پائی۔ ترک قوم اپنے ورثے سے کٹ کر رہ گئی۔ میں نے خود بہ چشم سر ترکی میں ایسے ہزاروں افراد دیکھے ہیں جو ترک ادب کے اس پورے ذخیرے سے اس طرح ناواقف ہیں، جس طرح مثلاً جرمن قوم ترک ورثہ سے ناواقف ہے۔ جو حیثیت ہمارے لیے اب سنسکرت رکھتی ہے۔ وہی

حیثیت اب ترک قوم کے لیے اس کا قدیم ورثہ رکھتا ہے۔ قدیم ورثہ جو ایک ہزار سال میں تیار ہوا تھا جو عربی اور فارسی کے بعد اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا مخزن تھا، وہ ترک قوم کے لیے ختم ہو گیا۔ اور یہی مصطفی کمال اور اس کے ہمراہیوں کا مقصد تھا کہ ترک قوم کو اس کے اسلامی ماضی سے کاٹ کر ایک نیا خود ساختہ اور مصنوعی مغربی ماضی پیدا کیا جائے۔ جو ترکی کے تعلق کو اسلام سے کاٹ کر مغرب سے وابستہ کر دے۔

یہی رویہ وسط ایشیا کی ریاستوں میں اپنایا گیا۔ وسطی ایشیا میں عرب رسم الخط ختم ہوا، پہلے وہاں روس کا سیریلک خط جاری ہوا۔ روس اور سویت یونین کے زوال کے بعد امید تھی کہ وہاں دوبارہ عربی رسم الخط کا آغاز ہو جائے گا لیکن پیر مغرب نے جو نسخہ ترکوں کو سکھایا تھا، وہی نسخہ سنٹرل ایشیا کے مسلمانوں کو سکھایا۔ اور انہوں نے وہاں رومن رسم الخط اپنانا شروع کر دیا۔ پھر یہی بات انڈونیشیا اور ملیشیا میں ہوئی، یہاں بھی عربی رسم الخط موجود تھا۔ عربی رسم الخط کو ختم کر کے رومن رسم الخط وہاں بھی اپنا لیا گیا اور بھی متعدد ممالک میں ایسا ہوا۔

شروع میں یہ کہا جاتا تھا کہ عربی رسم الخط جدید تقاضے پورے نہیں کرتا۔ اس لیے رومن رسم الخط اپنانا ناگزیر ہے۔ یہ نہ صرف انتہائی جاہلانہ بات تھی، بلکہ نہایت ہی پست ہمتی کی بات تھی۔ بالفاظ دیگر "دلیل" کا خلاصہ یہ تھا کہ چونکہ اہل مغرب نے پرنٹنگ پریس ایجاد کر لیا ہے۔ پرنٹنگ پریس سارے کا سارا انگریزی حروف کی بنیاد پر کام کرتا ہے۔ اور ہم چونکہ اتنے نااہل اور ناکارہ ہیں کہ ہم عربی حروف پر مبنی کوئی پریس ایجاد نہیں کر سکتے، اس لیے ہمیں رومن رسم الخط اختیار کر لینا چاہیے۔ حالانکہ تجربے نے چند سال کے اندر اندر تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہ بات غلط ثابت کر دی۔ آج عرب دنیا میں، ایران میں، جدید ترین پریس بھی کام کر رہے ہیں۔ کمپیوٹر بھی کام کر رہے ہیں اور آسانی سے سب کام کر رہے ہیں۔ کلیدی تختہ یا کی بورڈ جس کا پاکستان میں بھی ایک زمانے میں بہت مسئلہ بنایا گیا۔ اور اس کی بنیاد پر رومن رسم الخط کو اختیار کرنے کی دعوت دی گئی، وہ مسئلہ حل ہو گیا۔ یہ کسی نے نہ سوچا کہ اگر یورپ اپنے نامکمل رسم الخط کی بنیاد پر یہ سب کچھ کر سکتا ہے تو ہم اپنے مکمل رسم الخط کی بنیاد پر یہ کیوں نہیں کر سکتے۔ بجائے اس کے کہ ہمارے ارباب بصیرت اور احباب حل وعقد کچھ فکری آزادی کا مظاہر کرتے، تھوڑی سی جدت پسندی کا مظاہرہ کرتے، جس اجتہاد کی وہ علماء کرام کو دعوت دیتے رہتے ہیں، خود بھی اس اجتہاد سے کام لیتے تو یہ مسائل حل ہو سکتے تھے۔ لیکن غالباً مسئلہ کسی حقیقی یا وہمی مشکل کا نہیں تھا، بلکہ اصل ہدف یہ تھا کہ مسلمانوں کو ان کے ماضی سے کاٹ دیا جائے۔ ان کو قدیم اسلامی اور دینی ورثے سے محروم کر دیا جائے۔ وہ مقصد ترکی میں بھی پورا ہو گیا، سنٹرل ایشیا میں بھی پورا ہو گیا اور جہاں جہاں عربی رسم الخط ختم کیا گیا ہے وہاں یہ ہدف پورے طور پر حاصل کیا جا چکا ہے۔

سیکولرازم کا ایک بڑا نتیجہ دنیائے اسلام میں ہر جگہ یہ نکلا ہے کہ مسلم معاشرے شدید کش مکش کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ سب سے اہم مسئلہ یا تصور جس کو مانے بغیر سیکولرازم وجود میں نہیں آ سکتا۔ وہ یہ ہے کہ مذہب کو ایک شخصی معاملہ قرار دیا جائے۔ مذہب کا تعلق سیاست، معیشت، معاشرت اور قانون سے ختم کر دیا جائے۔ مغربی دنیا میں اس کی شاید ضرورت بھی تھی اور یہ کام آسان بھی تھا۔ اس لیے کہ مغربی دنیا جس مذہب کی پیروکار تھی، اس مذہب کی کتابوں میں قانون، معیشت، سیاست اور معاشرت سے متعلق کچھ ہدایت نہیں ملتی۔ اناجیل اربعہ ہوں، یا پورا عہد نامہ جدید، ان میں سرے سے کوئی بحث قانون کے بارے میں موجود نہیں ہے۔ اس میں معیشت اور معاشرت کے بارے میں سیاست اور حکومت کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں ہے۔ اس لیے اگر مغربی دنیا نے یہ سمجھا کہ مذہب ان میدانوں میں رہنمائی فراہم نہیں کرتا تو وہ ایسا سمجھنے میں شاید حق بجانب ہوں۔ اس لیے کہ واقعتا ان کا مذہب ان معاملات میں کوئی رہنمائی فراہم نہیں کرتا تھا۔ پھر مذہب کے نام پر ان کے ہاں ایک ہزار سال تک جو ظالمانہ اور جبریہ نظام رائج رہا ہے، اور مذہب کے نام پر مذہبی طبقے کی لیڈرشپ جس انداز سے قائم رہی ہے اس کا ردعمل یہی ہونا تھا کہ مذہب کو شخصی معاملہ قرار دیا جائے اور اجتماعیت کے دائرے سے نکال دیا جائے۔

لیکن جہاں مذہب کی اساس ہی قانون پر ہو۔ جہاں اخلاق اور قانون اتنے گہرے طور پر مربوط ہوں، جہاں، مذہبی اور روحانی زندگی کی کامیابی کی واحد بنیاد ہی قانون پر عمل درآمد ہو، جہاں روحانیت اور قانونیات ساتھ ساتھ چل رہے ہوں، وہاں یہ کہنا کہ قانون، ریاست اور سیاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، یہ جہالت اور ناواقفیت بھی ہے اور بہت بڑا المیہ بھی۔ چونکہ وہ طبقہ جو آج نظامِ حکومت چلا رہا ہے اس میں خاصی بڑی تعداد میں ایسے لوگ شامل ہیں، جو اسلامی روایات سے ناواقف ہیں اس لیے وہ شریعت کی تفصیلات جاننے سے نہ دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ ان کے مشاغل اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ سنجیدگی سے شریعت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ جس تصور مذہب سے مانوس ہیں وہ مسیحی تصور مذہب ہے۔ مسیحی تصور مذہب کی رو سے مذہب کو شخصی معاملہ ہی ہونا چاہیے۔ اہل مغرب کی کوشش یہی رہی کہ مذہب کو شخصی معاملہ قرار دلوا کر، پوری دنیائے اسلام کی اس وحدت اور یک جہتی کو ختم کر دیا جائے، جو ملتِ اسلامیہ سے وابستگی اور شریعت اسلامیہ پر ایمان کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔

آج جو طبقہ دنیائے اسلام میں بااثر ہے، وہ حکومتوں کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہو یا دوسرے معاملات میں بااثر ہو، وہ مغرب کے تصور تعلیم اور مغرب کے معیار تعلیم ہی کو کامیابی کی کنجی سمجھتا ہے۔ اگر مغرب کے معیار تعلیم یا تصور تعلیم سے مراد سائنس وٹیکنالوجی کی تعلیم ہو تو شاید اس غلط فہمی سے اتنی بڑی خرابیاں پیدا نہ ہوں۔ خرابیاں وہاں پیدا ہوتی جہاں مغرب کے تصور تعلیم، معیار تعلیم اور نصاب تعلیم کو

سوشل سائنسز اور علوم انسانی کے میدان میں اپنایا جاتا ہے۔علوم اجتماعی کا تعلق کسی قوم کے اجتماعی فلسفے سے ہوتا ہے۔علوم انسانی کا تعلق کسی قوم کے عقائد ونظریات سے ہوتا ہے۔ یہ قوم کے عقائد ونظریات ہیں، یہ کسی قوم کے اجتماعی تصورات ہیں جن کے نتیجے میں انسانی اور اجتماعی علوم کی تشکیل ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں دنیا اسلام میں گزشتہ دوسو برس سے جس جدید تعلیم کا چرچا ہے، وہ یہی اجتماعی اور انسانی علوم کی تعلیم ہے۔ انگریزی ادب، انگریزی لٹریچر، فلسفہ، انگریزی قانون، انگریزی تصورات ہی کے پڑھنے پڑھانے پر گزشتہ دوسوسال سے دنیائے اسلام میں زور دیا جارہا ہے۔ یہ بات شاید آپ میں سے بہت کم حضرات کے علم میں ہوگی کہ سرسید احمد خان نے جب علی گڑھ کالج قائم کیا تو وہ اس بات کے شدید مخالف تھے کہ یہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم دی جائے۔ وہ علی گڑھ کالج میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم دینے کے ہمیشہ مخالف رہے۔ چنانچہ علی گڑھ کالج میں ایک طویل عرصے تک انجینئرنگ، سائنس اور طب کے شعبے قائم نہیں ہوسکے۔ وہاں جو شعبے قائم تھے، ان میں زیادہ زور انگریزی زبان وادب، سوشل سائنسز اور ہومینیٹیز پر دیا جاتا۔خود سرسید کہتے تھے کہ ''پہلے ہماری قوم میں کامل سول لائیزیشن آجاوے۔'' یہ ان کے اپنے الفاظ تھے، اس کے بعد پھر بقیہ کاموں کی طرف توجہ دی جائے گی۔ سرسید ایسا کیوں سمجھتے تھے؟ یہ اللہ بہتر جانتا ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو چاہے مسلمانوں کے قائم کردہ اداروں میں پڑھتا رہا ہو، یا غیرمسلموں کے اداروں میں پڑھتا ہو، وہ اپنی ذہنی ساخت کے اعتبار سے عام مغربی تعلیم یافتہ انسان سے مختلف نہیں۔ ایک مغربی تعلیم یافتہ مورخ جس انداز سے تاریخ کو دیکھتا ہے، اسی انداز سے ایک جدید مسلمان مورخ بھی دیکھتا ہے۔ کسی ملک کے معاشی مسائل کو جس طرح ایک مغربی تعلیم یافتہ معیشت دان دیکھتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان ماہر معیشت بھی دیکھتا ہے۔ گویا یہ طبقہ اپنے وجود سے، اپنے رویے سے، طرزعمل سے، اس تصور کو دن بدن مضبوط سے مضبوط تر بنا رہا ہے کہ اسلامی روایات کے پاس، شریعت کے پاس، معیشت، اقتصاد اور بقیہ معاملات میں کوئی راہنمائی موجود نہیں ہے۔ اسلام ان معاملات میں رہنمائی فراہم نہیں کرتا۔

دوسری طرف ہمارا جو طبقہ دینی تعلیم سے متعلق ہے وہ اس بات پر شدت سے مصر رہا ہے کہ جدید دنیا میں جو کچھ بھی ہورہا ہے، جو کچھ بھی سوچا جارہا ہے، جو کچھ بھی لکھا جارہا ہے، اس سے مکمل طور پر صرف نظر کیا جانا چاہیے۔ اس طبقہ کے بیشتر افراد کی رائے میں دنیا میں جو بھی علوم وفنون مروج ہیں، ان سے ناواقف رہنے میں ہی دین ودنیا کی بھلائی ہے، لہٰذا دینی تعلیمی اداروں کو دنیا سے کٹ کر الگ جزیروں کی شکل میں رہنا چاہیے۔ یہی تصور ہے جو سیکولرازم کو تسلسل بخشنے کا ضامن ہے۔ یہ مذہبی اداروں کا الگ وجود اور اس پر اصرار، دوسری طرف جدید اداروں کا مغربی روایت پر قائم رہنا اور اسلامی تصورات کو نظرانداز کیے چلے جانا، ان دونوں رویوں کے نتیجے میں سیکولرازم کو فروغ ملتا چلا جارہا ہے۔

سیکولرازم کو فروغ ملنے کے نتیجے میں دنیائے اسلام میں تیزی سے وہ رجحان مضبوط ہوا ہے، جس کے تحت دینی رہنمائی کو اجتماعی معاملات سے نکال دیا گیا ہے۔ یہ جو مرد و زن کی مساوات کا مغربی اور لااخلاقی انداز کا تصور عام ہے، یہ جو اسلامی تصورات کو سمجھنے میں مشکل پیش آ رہی ہے، یہ جو حجاب کی مخالفت دنیا اسلام میں بھی ہو رہی ہے، دنیا اسلام سے باہر بھی ہو رہی ہے، اسلامی قوانین کو ازکار رفتہ اور دقیانوسی قرار دیا جا رہا ہے، مختلف اسلامی احکام پر جو اعتراضات کیے جا رہے ہیں، سود کی افادیت پر مضامین شائع ہو رہے ہیں، قمار و غرر کے دفاع میں تحریریں اور تحقیقات شائع ہو رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ایک دو دن میں نہیں ہوا۔ یہ اس دو سو سال کی بے عملی نتائج ہیں۔

آج ہمارا اباا اثر طبقہ اسلامی قوانین کو ازکار رفتہ قرار دیتا ہے، دقیانوسی اور قدیم قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ قوانین قدیم ہیں اور چودہ سو سال پرانے ہیں، اس لیے یہ آج کے زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اسلامی تہذیب چودہ سو سال پرانی ہے، اس لیے آج کی دنیا میں اس کی کوئی جگہ نہیں۔ چاہے زبان سے وہ یہ بات نہ کہتے ہوں، لیکن بہت سے لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں یہی جذبہ پایا جاتا ہے۔

اس کے باوجود قدیم تہذیبوں سے دلچسپی اس طبقے میں غیر معمولی طور پر پائی جاتی ہے۔ وہ مصر میں فرعونوں کی تہذیب ہو یا پاکستان میں ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے باقیات ہوں، یا بعض علاقوں میں قدیم بدھسٹوں کے باقیات ہوں، بعض ممالک میں قدیم رومن اثرات ہوں، ان کی حفاظت اور ان کا تحفظ اسلامی آثار سے بڑھ کر کیا جاتا ہے۔ آج پاکستان میں ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے آثار کے تحفظ کے لیے ادارے قائم ہیں، حکومت کے فنڈ موجود ہیں، بین الاقوامی ایجنسیز اور اداروں کے فنڈ موجود ہیں لیکن محمد بن قاسم کی پہلی مسجد، جو پہلی مرتبہ برصغیر میں بنائی گئی اروڑ کی مسجد، اس کے تحفظ، اس کی تجدید یا تزئین کے لیے حکومت پاکستان کے پاس فنڈ نہیں ہیں اور حکومت سندھ کے پاس وسائل نہیں۔ حکومت سندھ میں اور مرکزی حکومت میں ایسے لوگ شامل ہوتے اور اعلیٰ مناصب پر فائز ہوتے رہے جو سندھ کے نام پر ووٹ لیتے رہے، جن کو سندھ کی شخصیت اور تشخص کے تحفظ کا ہمیشہ خیال رہا۔ انہوں نے بھی سندھ کی اس قدیم ترین مسجد کو، سندھ کا ورثہ نہیں سمجھا۔ وہ سندھ کا ورثہ موہنجوداڑو ہی کو سمجھتے ہیں۔ اسلامی تہذیب سے لاتعلقی اور قدیم تہذیبوں سے دلچسپی سیکولرازم کے منطقی نتائج اور لازمی اثرات ہیں۔

آج صورت حال یہ ہے کہ انسانی تاریخ کی دو طاقتور تہذیبیں، مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب اس وقت برسر پیکار ہیں۔ یہ دونوں تہذیبیں، اپنی وسعت، جامعیت اور عسکری قوت کے اعتبار سے انسانی تاریخ کی نمایاں ترین تہذیبیں ہیں۔ جتنا سیاسی اثر و رسوخ اور تاثیر ان دونوں تہذیبوں کو حاصل رہی ہے، کسی اور تہذیب کو حاصل نہیں رہی۔ یہ دونوں تہذیبیں ایک فکر و فلسفے پر مبنی ہیں۔ ان دونوں کی پشت پر افکار و نظریات کا ایک پورا نظام موجود ہے۔ ان دونوں تہذیبوں نے جو جو علوم اور حکمت و دانش پیدا کیے

ہیں وہ پوری طرح ان دونوں تہذیبوں کے مؤید اور مدافع ہیں۔

آج مغربی تہذیب ان تمام میدانوں میں بہت غالب اور بالا دست معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کو وہ بالا دستی حاصل نہیں ہے۔ اسلامی تہذیب کا دفاع کرنے والی آوازیں بہت کمزور محسوس ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی حکمرانوں کی طرف سے بھی مدافعت کی یہ آوازیں اٹھ جاتی ہیں، اگرچہ ایسا کم ہوتا ہے لیکن ایسی آوازیں زیادہ تر عامۃ الناس کی طرف سے اُٹھتی ہیں اور ان آوازوں کو خاموش کر دینا اہل مغرب کا معمول ہوتا ہے۔ یہ کشمکش برابر کی سطح پر نہیں ہے۔ دونوں فریقوں کے مادی وسائل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ دونوں فریق اس وقت برابر کے فریق نہیں ہیں۔ مادی اعتبار سے، وسائل کے اعتبار سے، ان کے مابین بہت گہرا تفاوت پایا جاتا ہے۔ البتہ یہ دونوں تہذیبیں ایک اعتبار سے برابر ہیں وہ یہ کہ ان دونوں تہذیبوں کے مؤیدین اس عزم وارادے سے بھرپور ہیں جو عزم و ارادہ کسی قوی تہذیب کے پیروکاروں میں پایا جاتا ہے۔ جو آوازیں اسلامی تہذیب کے احیاء اور بقا کے لیے اٹھ رہی ہیں۔ وہ آوازیں اٹھانے والے اپنے عزم و ہمت میں مغربی تہذیب کے علمبرداروں سے کم نہیں ہیں۔ ایک اعتبار سے اسلامی تہذیب کو بالا دستی آج بھی حاصل ہے، وہ اخلاقی بالادستی ہے، افکار و نظریات کی جامعیت کی بالا دستی ہے، وہ افکار ونظریات میں ہم آہنگی اور یک جہتی کا پہلو ہے۔ اس پہلو سے دنیائے اسلام آج بھی بہت سے ایسے نمایاں امتیازات کی حامل ہے جو اہل مغرب کو حاصل نہیں ہیں۔

دنیائے اسلام اور مغرب سے تعلقات اور روابط کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ تاریخی حقیقت نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ اہل مغرب کی پیش قدمی دنیائے اسلام میں جب بھی ہوئی ہے، تجارت اور اقتصادی خوشحالی کے نام پر ہوئی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تہذیب کو دنیائے مغرب و مشرق میں جب بھی پیش قدمی حاصل ہوئی، وہ اخلاق و کردار اور روحانی مقاصد کے نام پر ہوئی۔ اسلامی تہذیب جہاں بھی گئی وہ ان روحانی اقدار کو لے کر گئی، اس اخلاقی پیغام کو لے کر گئی، اس کردار اور انسانی مساوات کو لے کر گئی جس کا اسلام علمبردار ہے۔ مسلمانوں کے قدم جہاں بھی پہنچے، مشرق سے لے کر مغرب تک، شمال سے لے کر جنوب تک، وہاں جو جو لوگ ان سے متاثر ہوئے ان کی زندگی میں آج بھی وہ اثرات محسوس ہوتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے قدم جہاں تک پہنچے، وہ علاقہ آج بھی مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ جو علاقے صحابہ کرامؓ نے فتح کیے ہیں، صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں فتح ہوئے ہیں، وہ علاقے آج بھی مسلم اکثریت کے علاقے ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے ان میں سے کسی کو زبردستی مسلمان نہیں کیا۔ یہ لوگ صحابہ کرامؓ کے بہت بعد کے زمانہ میں مسلمان ہوئے ہیں۔ یہ تمام علاقہ شام، عراق، مصر، ایران یہ کئی سو سال تک غیر مسلم اکثریت کے علاقے رہے، لیکن اخلاق و کردار کی جو شمع صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں روشن ہوئی تھی، اس سے یہ سب لوگ نور حاصل کرتے رہے۔ بہت جلد ایک زمانہ ایسا آیا کہ یہ پورے علاقے

اسلامی تہذیب کے علاقے بن گئے۔ اس کے مقابلے میں مغربی تہذیب اقتصادی ترقی اور مادی خوشحالی کے نام پر وجود میں آئی تھی۔ اس اقتصادی ترقی اور خوشحالی کے فوائد مغرب کو تو حاصل ہوئے، لیکن دنیائے اسلام کو یہ فوائد یا تو حاصل نہیں ہوئے یا بہت محدود اور وقتی ثابت ہوئے۔ البتہ وہ اثرات جن کا براہ راست تعلق مغرب کے مفادات اور بالادستی سے تھا، وہ بہت بھرپور بھی ثابت ہوئے اور دیرپا بھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جب ہندوستان میں آئی تھی تو کس نام سے آئی تھی؟ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب یہاں کے حکمرانوں سے تجارتی مراعات حاصل کیں تو مادی فوائد اور اقتصادی خوشحالی، تجارتی سرگرمی کے نام پر ہی یہ سب فوائد حاصل کیے۔ یہ بات کہنے میں آج کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ جن مسلمان حکمرانوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو مراعات سے نوازا، انہوں نے اپنی ذہنی دوررسی کا اچھا نمونہ پیش نہیں کیا۔ فوری اور مختلف مادی فوائد کی خاطر، جو حاصل بھی نہیں ہوئے۔ انہوں نے ایک ایسا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں جابجا اپنے مراکز قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ مرکز وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فوجی چھاونیوں اور کیمپوں میں تبدیل ہوگئے اور بالآخر پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

تیل کی کمپنیاں عرب ممالک میں گئیں، ورلڈ بینک دنیا کے دوسرے ملکوں میں آیا۔ گلوبلائزیشن کے نام پر دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ڈبلیوٹی او کے نام پر کیا کیا ہو رہا ہے؟ آئی ایس او (ISO) کے نام سے جو ادارے ہیں وہ جو کچھ کر رہے ہیں سب اقتصادی ترقی کے نام پر ہو رہا ہے۔

آج ہمارا حکمران اور بااثر طبقہ اس موہومہ اقتصادی خوشحالی پر اسی طرح خوشی محسوس کرتا ہے جس طرح آج سے دوسو سال پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد پر ہوا تھا۔ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ کا اور آج کی گلوبلائزیشن، ڈبلیوٹی او اور آئی ایس او کا جائزہ لیا جائے، تقابلی مطالعہ کیا جائے تو واضح طور پر اندازہ ہوجاتا ہے کہ دونوں کے تصورات اتنے مشابہ ہیں اور ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسی قدیم تجربے اور مجرب نسخے کو سامنے رکھ کر نیا نقشہ بنایا گیا ہے۔ بہرحال یہ وہ نتائج تھے جو سیکولرازم کے نتیجے میں بالآخر سامنے آئے۔

سیکولرازم میں سب سے ابتدائی قدم جن قوموں نے اُٹھایا، ان میں ترکوں کا نام بہرحال شامل ہے۔ ترکوں کی کوتاہیوں کا خمیازہ پوری دنیا اسلام کو بھگتنا پڑا۔ لیکن ترکوں کی یہ کوتاہی محض حکمرانوں کی کوتاہی نہیں تھی۔ سب سے پہلے یہ ترک علماء کی کوتاہی تھی۔ علماء نے ان مسائل کا حل پیش کرنے میں کوتاہی کی، جن کو حل کرنا فوری ضرورت تھا۔ جن کا اسلامی حل تجویز کرنا علماء کی ذمہ داری بھی تھی، فرض منصبی بھی تھا، قومی اور ملی ذمہ داری بھی تھی۔ وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں رہے، ناکام رہے۔ یہ سیاسی

قائدین کی بھی کوتاہی تھی۔ یہ ادیبوں اور اہلِ صحافت کی بھی کوتاہی تھی اور عام تعلیم یافتہ طبقوں کی کوتاہی بھی تھی۔ اس پوری کوتاہی کا جو نتیجہ نکلا وہ سلطنت عثمانیہ کی شکست وریخت کے نتیجے میں نکلا۔ دنیائے اسلام میں سیکولرازم کے فروغ کی صورت میں نکلا۔ سیکولرازم کے نتیجے میں علاقائی نیشنل ازم کے بھوت اور عفریت نے بوتل سے سر نکالا۔ اس عفریت نے دنیائے اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ دنیائے اسلام چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ مزید تقسیم در تقسیم کے منصوبے بنائے جارہے ہیں۔ علاقائی نیشنل ازم کی کوکھ سے جنم لینے والے یہ سارے فتنے بھی مسلمانوں کو وہ سبق سکھانے میں کامیاب نہیں ہوئے جو دوسوسال پہلے آزمایا گیا تھا، جو پچھلی صدی ہجری کے شروع میں آزمایا گیا تھا اور آج اکیسویں صدی میں اور پندرہویں صدی ہجری میں بھی آزمایا جارہا ہے۔

جب سیکولرازم کا یہ تصور دنیائے اسلام کے موثر طبقے میں پھیل گیا تو پھر اسلامی قوانین میں بھی ترامیم کا آغاز شروع ہوا۔ یہ بات حیرت انگیز بھی ہے اور اہم بھی ہے کہ استعمار کے دور میں، مسلم ممالک میں بالعموم، اسلامی قوانین میں کسی ترمیم کی کوشش نہیں ہوئی۔ اکادکا آوازیں اُٹھتی رہیں، لیکن وہ بہت بے اثر اور معمولی آوازیں تھیں۔ اس کے مقابلے میں جو آوازیں اُٹھیں وہ اسلامی قوانین کے نفاذ کی آوازیں تھیں۔ اسلام کے عائلی اور شخصی قوانین کی بنیاد پر قانون سازی کی آوازیں تھیں، جن میں دنیائے اسلام کے تمام طبقات نے حصہ لیا۔ برصغیر کی مثال اگر ہم سامنے رکھیں تو نظر آتا ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح، علامہ اقبال، مولانا شبلی نعمانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی کفایت اللہ صاحب، محمد احمد کاظمی اور ان جیسے بہت سے حضرات نے یہ کوششیں کیں اور وہ ان کوششوں میں کامیاب ہوئے کہ اسلام کے شخصی قوانین، انگریزی عدالتوں اور انگریزی قانون ساز اداروں کے ذریعے نافذ کرائے جائیں لیکن جیسے ہی آزادی کا عمل مکمل ہوا اور دنیائے اسلام کے مختلف ممالک آزاد ہوئے تو یکایک یہ آوازیں بہت قوی ہوگئیں کہ اسلام کے شخصی قوانین میں ترامیم کی جائے۔ اسلام کے بارے میں بہت سے احکام کے بارے میں شکوک وشبہات کو ہوا دینے کا عمل زور وشور سے بڑھ گیا۔ چنانچہ بہت سے خوشنما عنوانات کو استعمال کرتے ہوئے مغربی تصورات کو فروغ دینے کی کوششیں تیزی سے کی جانے لگیں۔

اہلِ مغرب کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ اپنے ہر کام کے لیے اچھے عنوانات تراشتے ہیں۔ ان اچھے عنوانات کے مندرجات جتنے بھی مکروہ اور ناقابل قبول ہوں، ان کا عنوان ہمیشہ قابل قبول اور جاذب نظر ہوتا ہے۔ چنانچہ مغربی ممالک میں موجود معاشرتی افراتفری، خاندان کے ادارے کی شکست وریخت، عام بے حیائی، مردوزن کے درمیان تعلقات میں فسادات، ان تمام خرابیوں کا نام وہاں مساوات مردوزن ہے۔ مساوات کے نام سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ مردوزن کے درمیان مساوات ہونی

چاہیے۔خواتین کو وہی حقوق ملنے چاہئیں، جو مردوں کو ملتے ہیں۔مردوں کے حقوق وفرائض ویسے ہی ہونے چاہئیں جیسے عورتوں کے حقوق وفرائض ہیں۔اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔لیکن اس عنوان کے تحت جو مندرجات بیان کیے جاتے ہیں وہ اسلامی تصورات کے لحاظ سے قطعاً ناقابل قبول ہیں۔ شریعت نے بعض حالات میں تعدادازواج کی اجازت دی ہے۔تعدادازواج کو شریعت نے اس طرح ناپسندیدہ قرار نہیں دیا جس طرح مغربی تہذیب میں قرار دیا جاتا ہے۔شریعت نے بعض مصلحتوں کے تحت طلاق کا حق مردوں کو دیا ہے۔یہ بنیادی طور پر مرد کا حق ہے کہ وہ طلاق کے حق کو استعمال کرے۔ ولایت نکاح باپ کو، چچا کو، یا بڑے بھائی کو حاصل ہے۔مطلقہ عورت کو نفقہ کتنا دیا جائے اور کیسے دیا جائے؟ یتیم پوتے کی وراثت کیا اور کیسے ہو؟ یہ وہ معاملات ہیں جہاں شریعت کے متعین اور طے شدہ اصولوں پر مبنی یہ واضح احکام موجود ہیں۔ان سب کو نظرانداز کرکے محض عدل اور مساوات کے مغربی نعروں سے متاثر ہوکر مغربی گمراہیوں کو عام کیا جائے یہ استعمار کے دور میں نہیں ہوا تھا۔یہ بات دنیائے اسلام کے کئی ممالک میں آزادی کے بعد ہی ممکن ہوئی۔

دنیائے اسلام کے متعدد ممالک میں یہ تصورات ایک ایک کرکے پھیلائے گئے جس کی رو سے ان تمام قوانین کے بارے میں ایک بے اعتمادی کی فضا پیدا ہوئی۔اس بے اعتمادی کے ماحول میں ان قوانین میں ترمیم کا کام آسان ہوگیا۔چنانچہ کئی ممالک میں ایسی ترامیم کی گئیں جو اسلامی تاریخ میں کبھی سوچی بھی نہیں گئیں۔ان میں سے بیشتر ترامیم کا ماخذ صرف مغربی قوانین تھے۔یہ ماٰخذ یا تو سوئٹزرلینڈ کا سول کوڈ تھا، یا فرانس کا کوڈ ناپولیاں تھا، یا انگریزی قوانین تھے۔

یہاں ایک بات بہت عجیب ہے۔وہ یہ کہ یہ مغربی قوانین جن کے نفاذ کی دعوت ہمارا ایک طبقہ دیتا رہا ہے۔ان مغربی قوانین کے انتخاب میں بھی اس طبقے نے کسی جدت یا ناقدانہ صلاحیت کا ثبوت نہیں دیا۔مغربی دنیا کے جو علاقے فرانس کے زیر اثر تھے وہاں فرانسیسی قوانین ہی کو معیار سمجھا جاتا ہے۔جو چیز فرانس میں ہوئی ہے وہ حق اور صداقت کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔عدل وانصاف کے اعلیٰ ترین نظام معیار پر اس طبقہ کے نزدیک فرانسیسی ہی پورا اترتا ہے لہٰذا اسے اختیار کرلیا جائے۔اس کے برعکس ہمارے ہاں ہر وہ چیز جو انگلستان یا امریکا میں ہوئی اسے اختیار کرلینے کو جدت اور ترقی کی معراج مانا جاتا ہے۔اس سے یہ پتہ یہ چلا کہ ان تصورات کا علمی مطالعہ کسی نے نہیں کیا۔محض ذاتی واقفیت اور مرعوبیت کی وجہ سے ان تصورات کو قبول کرنے کی دعوت دی جارہی ہے۔اگر ان تصورات کی کسی ذاتی خوبی کی وجہ سے یہ مطالبہ کیا گیا ہوتا تو کم ازکم ایک مثال تو ایسی ملتی کہ کسی صاحب علم نے انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی ان تمام قوانین کا ایک تنقیدی تقابلی جائزہ لیا ہوتا۔مطالعہ کرنے کے بعد، جائزہ لینے کے بعد، کسی ایک تصور کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہوتا۔پھر اس تصور کا اسلامی تصورات سے مقابلہ کیا گیا ہوتا اور پھر یہ ثابت

کیا گیا ہوتا کہ ان تصورات میں کیا خوبی ہے اور اسلامی تصورات میں کیا خامی ہے؟ اگر ایسا کیا جاتا تو پھر واقعی اس میں جان ہوتی کہ مغربی قوانین کا فلاں اصول پیروی کے قابل ہے، پھر اس دعوے میں کوئی بنیاد ہوتی۔ لیکن ایسا کہیں نہیں ہوا، نہ فرانسیسوں کے مریدوں نے ایسا کیا۔ وہاں فرانس نے جو نتیجہ لکھ کر دیا اس پر عملدرآمد کی دعوت دے دی گئی۔ یہاں انگریز نے جو نتیجہ لکھ کر دیا اس پر عملدرآمد کی دعوت دی جارہی ہے۔

یہ صورت حال ہے جو گذشتہ سوسوا سو برس سے دنیائے اسلام کو درپیش ہے۔ لیکن اس منفی صورت حال کے ساتھ ساتھ دنیائے اسلام میں آج بہت سے ایسے مثبت پہلو بھی موجود ہیں جو ایک انتہائی خوش آئند اسلامی مستقبل کے غماز ہیں۔ ان سے ایک ایسے اسلامی مستقبل کی نوید ملتی ہے جہاں اسلامی شریعت کے احکام کی بنیاد پر قوانین بنائے گئے ہوں، اجتماعی زندگی کے ڈھنگ اور نظام شریعت کی بنیاد پر استوار ہوئے ہوں، زندگی کے تمام معاملات کا ایک نیا نہج دنیا کے سامنے رکھا جارہا ہو اور دنیا کو کامیابی کے ساتھ یہ بتایا جارہا ہو کہ اسلام کے احکام اور تصورات آج بھی اسی طرح مؤثر اور قابل عمل ہیں جس طرح ماضی میں مؤثر اور قابل عمل تھے۔

اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے درمیان کشمکش کی یہ داستان بظاہر حوصلہ شکن معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ شاید مستقبل کی لگامیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھوٹ چکی ہیں۔ لیکن معاملات کو ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس پوری کشمکش کے دوران مسلمانوں کا بہت بڑا طبقہ، عامۃ الناس کی بہت بڑی تعداد نہ صرف پرامید رہی ہے بلکہ ان مصائب اور تکالیف کے سمندروں سے گزرنے کے نتیجے میں ان کا ایمان اسلامی شریعت پر پہلے سے بہت زیادہ مضبوط ہوا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بہت بڑی تعداد از سر نو اسلامی شریعت کی طرف متوجہ ہوئی ہے اور ایک بہت بڑا طبقہ ایسا پیدا ہوا ہے جو جہاں مغرب کو خوب سمجھتا ہے وہاں اسلامی شریعت پر ایمان اور شریعت کے از سر نو نفاذ کے لیے اپنے عزم میں، کسی بھی دوسرے پرجوش مخلص مسلمان سے کم نہیں ہے (محاضراتِ شریعت)۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا

تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

نام.. پتہ ....
فون ....

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ھیں

پاکستانیات ڈاکٹر محمد امین

پاکستان میں انتہا پسندی اور دہشت گردی

اسباب وعلاج

عساکر پاکستان کے سربراہ نے ۱۴/اگست ۲۰۱۲ء کی شب یوم پاکستان کے حوالے سے ایک عسکری تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا (حسب رپورٹ روزنامہ نوائے وقت لاہور) کہ اگر انتہا پسندوں کو ختم نہ کیا گیا تو ملک میں خانہ جنگی کا خطرہ ہے۔ انہوں نے کہا انتہا پسندی یہ ہے کہ اپنی رائے کو حتمی سمجھا جائے۔ دہشت گردی یہ ہے کہ اپنی رائے کو دوسروں پر مسلط کیا جائے اور خود کو عقل کل سمجھنا شرک کے مترادف ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اسلام اور پاکستان لازم وملزوم ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ جنرل صاحب نے خاموش رہنے یا گول مول بات کرنے کی بجائے کھل کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے اور انتہا پسندی و دہشت گردی کی متعین 'تعریف' کی ہے اور گویا ایک فارمولا مرتب کر دیا ہے جس کے مطابق یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ کون انتہا پسند ہے اور کون دہشت گرد؟ ہم یہاں جنرل صاحب کے فارمولے کو بنیاد بناتے ہوئے پاکستان میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کے حوالے سے کچھ معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں انتہا پسندی اور دہشت گردی کو عموماً صرف مذہبی انتہا پسندی اور مذہبی دہشت گردی تک محدود سمجھا جاتا ہے جو اصولاً غلط ہے۔ انتہا پسندی تو انتہا پسندی ہے خواہ

وہ مذہبی ہو یا سیاسی وفکری اوراسی طرح دہشت گردی تو دہشت گردی ہے خواہ وہ کسی مذہبی گروہ کی طرف سے ہو یا کسی غالب بدیسی فکر وتہذیب کے علم برداروں کی شہ پر حکومت اوراس کے اداروں کی طرف سے ہو۔لہٰذا جنرل صاحب کی تعریفات کا اطلاق ہر طرح کی انتہا پسندی پر ہونا چاہیے خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی وفکری۔ **دوسری** اہم بات یہ کہ مظاہر اور علامات پر جھگڑنا بیوقوفی ہے۔عقل ودانش کا تقاضا یہ ہے کہ مظاہر کے حقیقی اسباب پر غور کیا جائے اوران کے مطابق علاج کیا جائے تاکہ مرض کی شدت وتکلیف میں کمی آسکے۔

مذہبی انتہا پسندی ودہشت گردی

ان تمہیدی گزارشات کے بعد آیئے اب پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی اوراس کے اسباب پر غور کریں۔جنرل صاحب کی تعریف کی روشنی میں پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی یہ ہے کہ یہاں بعض دینی عناصر پاکستانی حکمرانوں کی مغرب پرستی اور خلاف اسلام پالیسیوں کی وجہ سے اس بات سے مایوس ہوگئے ہیں کہ یہاں پرامن طریقے سے شریعت نافذ ہوسکتی ہے (جوکہ ہونی چاہیے کیونکہ بقول جنرل صاحب 'اسلام اور پاکستان لازم وملزوم ہیں' مطلب یہ کہ پاکستان مسلم اکثریت کا ملک ہے اوراسی لیے وجود میں آیا تھا کہ مسلمان یہاں اپنی زندگیاں اسلامی اصول واقدار کے مطابق بسر کرسکیں)۔لہٰذا ان دینی عناصر نے حکومت پاکستان کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے ہیں اوراسے بقوت ختم کرکے اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ یہاں شریعت نافذ کرسکیں۔

ان دینی عناصر کی یہ رائے جنرل صاحب کی تعریف کے مطابق انتہا پسندی ہے کیونکہ پاکستان کے دینی عناصر اور علماء کرام کی اکثریت اس رائے کی قائل نہیں ہے۔اس کے برعکس وہ یہ سمجھتی ہے کہ ابھی پاکستان میں اسلام کے حق میں پرامن تبدیلی کے سارے راستے بند نہیں ہوئے اور حکمران طبقوں کا رویہ غلط اور گمراہ کن ہونے کے باوجود ابھی ایسے کفر بواح تک نہیں پہنچا کہ ان کی تکفیر کی جائے اوران کے خلاف خروج کیا جائے۔ پاکستان کے جمہور علماء کی اس رائے کے برعکس چونکہ مذکورہ 'بعض دینی عناصر' اپنی اقلیتی رائے کو حتمی سمجھتے ہیں اس لیے ان کے موقف کو انتہا پسندی قرار دیا جاسکتا ہے اور چونکہ وہ اپنی رائے قوت سے دوسروں پر ٹھونسنا چاہتے ہیں لہٰذا ان کی مسلح جدوجہد کو جنرل صاحب کی تعریف کے مطابق دہشت گردی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

سیاسی اور فکری انتہا پسندی اور دہشت گردی

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کا سبب کیا ہے؟ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ پاکستان کے حکمران طبقات یہاں اخلاص اور صدق دل سے اسلام نافذ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ 'اسلام اور پاکستان لازم وملزوم ہیں' کا نعرہ تو ضرور لگاتے ہیں لیکن عملاً سارے شعبہ حیاتِ حیات میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی بجائے مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کے اصول واقدار کو ملک میں رائج کر رہے ہیں بلکہ کر چکے ہیں اور صرف دباؤ کے تحت مجبوراً کچھ رسمی اور سطحی قسم کے، برائے نام اور غیر موثر اسلامی اقدامات کر کے اپنے آپ کو، اللہ کو اور مسلمان عوام اور دینی عناصر کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم نے پاکستان میں اسلام نافذ کر دیا ہے۔

گویا پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کا اصل سبب یہاں کے حکمران طبقات یا 'اسٹیبلشمنٹ' (جاگیردار وسرمایہ دار سیاستدان، فوجی اور سول بیوروکریسی وغیرہ) کی سیاسی اور فکری انتہا پسندی اور دہشت گردی ہے کیونکہ پاکستان کے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت، سوائے مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب چند فیصد کمزور ایمان والے لوگوں کے، اپنی انفرادی زندگی، معاشرے اور ملک میں اسلامی تعلیمات کا نفاذ چاہتی ہے لیکن حکمران طبقات کی یہ معمولی سی اقلیت، مغرب کی خواہش اور ترغیب پر، اپنے معاشرے کو مغربی اصول واقدار کے مطابق چلا رہی ہے اور اپنی رائے کو حتمی سمجھتی ہے لہٰذا جنرل صاحب کی انتہا پسندی کی تعریف کے مطابق یہ معمولی اقلیت یقیناً 'انتہا پسند' ہے۔ پھر وہ اپنی رائے کو حتمی ہی نہیں سمجھتی اسے قوت سے عوام کی بہت بڑی اکثریت پر زبردستی مسلط بھی کیے ہوئے ہے اور اس کے لیے وہ مملکت کے سارے ذرائع (اربوں روپے، پولیس، فوج، نوکرشاہی سب کچھ) استعمال کر رہی ہے لہٰذا خود جنرل صاحب کی دہشت گردی کی تعریف کے مطابق یہ حکمران طبقات دہشت گردی کے مرتکب بھی ہو رہے ہیں جسے مذہبی دہشت گردی کے مقابلے میں سیاسی، فکری یا ریاستی دہشت گردی کہا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جنرل صاحب کی تعریف کے مطابق بلاشبہ پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی ہو رہی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس انتہا پسندی اور دہشت گردی کا بنیادی سبب ہمارے حکمران طبقات کی سیاسی اور فکری انتہا پسندی اور دہشت گردی ہے۔

خانہ جنگی

جب عوام میں سے بعض دینی عناصر نے، عوام اور جمہور علماء کی رائے کے برعکس، اپنی رائے پر

اصرار کرتے ہوئے حکومت کے خلاف نفاذ شریعت کے لیے ہتھیار اٹھا لیے ہیں اور جب حکمران طبقات نے عوام اور جمہور علماء کی رائے کے برعکس اپنی اقلیتی رائے پر اصرار کرتے ہوئے عوام اور دینی عناصر کے نفاذ شریعت کے مطالبے کو رد کرتے ہوئے، مذکورہ انتہا پسند دینی عناصر کو کچلنے کے لیے اسلحی قوت استعمال کرنا شروع کر دی ہے تو خانہ جنگی تو شروع ہے، یہ تو ہو رہی ہے۔ مسلمان مسلمان کو قتل کر رہا ہو تو خانہ جنگی تو اسی کو کہتے ہیں۔ ایک انتہا پسند فریق کا موقف یہ ہے کہ وہ شریعت نافذ کرنا چاہتا ہے، دوسرا اسلام کا نام لے کر مغربی فکر و تہذیب کو رائج کرنا چاہتا ہے۔ کچھ بھی ہو نا قابل انکار حقیقت یہ ہے کہ مسلمان مسلمان کو مار رہا ہے اور یہ افسوسناک ہے۔ اس سلسلے کو ختم ہونا چاہیے پیشتر اس کے کہ یہ پھیل جائے اور عوام و علماء کی اکثریت اس میں شامل ہو جائے اور معاشرہ و ریاست تباہ ہو جائے۔

علاج کیا ہے؟

انتہا پسندی اور دہشت گردی کا یہ سلسلہ کیسے ختم ہوسکتا ہے؟ بظاہر یہ بہت آسان ہے۔ ہمارے حکمران طبقات اگر صدق دل سے پاکستان میں شریعت نافذ کرنے کا تہیہ کر لیں اور محاربین کو اپنے اسلامی اقدامات سے مطمئن کر دیں تو یہ لڑائی ختم ہو جائے گی ☆لیکن بات اتنی سادہ نہیں ہے اور پس پردہ چھپی ہوئی پیچیدگی یہ ہے کہ امریکہ و یورپ ہی نے یہ لڑائی شروع کرائی ہے اور وہی اسے ختم نہیں ہونے دیتے بلکہ وہ اسے جاری رکھنے پر مصر ہیں تاکہ مسلمان مسلمان کو مارتا رہے، پاکستان کمزور ہوتا رہے اور انہیں پاکستان کو (خدانخواستہ) توڑنے کے لیے آسانیاں میسر آتی رہیں۔

پاکستان میں یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ کسی اتفاق اور حادثے کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ اسلام اور مسلمانوں کو کچلنے کے لیے مغرب کی طویل اور سوچی سمجھی حکمت عملی کا ایک اہم حصہ ہے۔ مغرب نے مسلمانوں کو کمزور پڑتا دیکھ کر سازشوں سے انہیں چت گرا دیا، ان کو غلام بنا لیا، ان کو لوٹا، ان کے معاشرے کے سیاسی، سماجی، تعلیمی، قانونی...... عدالتی ڈھانچے کو توڑ کر اپنی فکر و تہذیب کے مطابق ان کی تشکیل نو کی تاکہ مسلمان ہمیشہ ان کے غلام رہیں۔ جب اللہ کی کرشمہ سازی اور مسلمانوں، خصوصاً دینی عناصر کی جدوجہد سے، ان کے لیے مسلمان ممالک کو غلام رکھنا ممکن نہ رہا تو مغرب نے انہیں برائے نام جغرافیائی آزادی دے دی۔ وہاں اپنی مرضی کے حکمران بٹھا دیے اور امن و جمہوریت کا چولا اوڑھ کر ان کی سیاست، معیشت، تعلیم، میڈیا، غرض سارے شعبہ ہائے حیات میں دخیل ہو گیا۔ اسلامی قوتوں کو حیلے بہانے ہزیمت دلوائی اور مسلمان ملکوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلوانے لگا لیکن غلامی چونکہ مسلمانوں کی سرشت میں نہیں ہے لہٰذا کچھ مسلمان ممالک مغرب کی کوششوں اور سازشوں کے باوجود، بعض شعبوں میں آگے نکل گئے۔ ہمارے

خطے میں خصوصاً دو باتیں اس کی مرضی کے خلاف ہوئیں: ایک پاکستان ایٹمی قوت بن گیا اور دوسرے افغانستان میں طالبان نے ٹھیٹھ اسلامی حکومت قائم کر لی۔

ان دو باتوں اور دوسرے بہت سے معاملات کی وجہ سے، جن کی تفصیل میں اگر ہم گئے تو موضوع سے دور ہٹ جائیں گے، لہٰذا مختصراً عرض کرتے ہیں کہ امریکہ نے یورپ کو ساتھ ملا کر افغانستان پر حملہ کیا۔ طالبان کی حکومت ختم کی اور اب وہ ایٹمی پاکستان کو توڑنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس نے کئی محاذ کھول رکھے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے پاکستان میں اپنی مرضی کی حکومت قائم کر رکھی ہے اور

☆ پاکستان میں کون سی شریعت نافذ ہونی چاہیے؟ اس سوال یا اعتراض کا جواب دینے کے لیے 'ملی مجلس شرعی' نے بڑی محنت سے سارے دینی مسالک کے علماء کرام کی طرف سے منظور شدہ ایک متفقہ دستاویز تیار کر لی ہے جس سے اس ضمن میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس کے ذریعے وہ پاک فوج کو قبائلی مسلمانوں کے خلاف لڑا رہا ہے (بہانہ یہ ہے کہ وہ افغان طالبان کی مدد کرتے ہیں) دوسری طرف اس نے پاکستانی طالبان میں اپنے ایجنٹ چھوڑ رکھے ہیں اور ڈالر و اسلحہ سے ان کی مدد کرتا ہے اور انہیں پاکستان کی فوج سے لڑاتا ہے۔ یوں پاکستانی مسلمان ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں اور پاکستان کمزور و برباد ہو رہا ہے۔

اس خانہ جنگی سے بچنے اور پاکستان کو تباہی و بربادی سے بچانے کا راستہ کیا ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا حل بالکل سادہ ہے اور وہ یہ کہ پاکستان 'دہشت گردی کے خلاف' اس نام نہاد جنگ سے باہر نکل آئے کیونکہ یہ درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے لیکن پاکستان یہ فیصلہ اس لیے نہیں کر سکتا کہ یہاں کے حکمران طبقات امریکہ کی غلامی سے نکلنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ اب اس کا ایک ہی حل ہے کہ پاکستان کے عوام متحد ہو کر ان امریکی غلاموں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور وہ قوتیں جو نفاذ شریعت اور امریکی تہذیب اور اس کی غلامی سے نجات کی خاطر ان حکمرانوں سے خلاصی چاہتی ہیں، وہ متحد ہو کر عوام کو ان کے خلاف حرکت میں لائیں، ورنہ ہم جیسے لوگ جو صرف کاغذوں کا پیٹ بھر سکتے ہیں وہ تو قلم چلاتے ہی رہیں گے، اس عزم کے ساتھ کہ ہم پاکستان سے محبت کرتے ہیں، اس کی اسلامی اساس سے محبت کرتے ہیں اور اپنی فوج سے بھی محبت کرتے ہیں جس کی ذمہ داری پاک سرزمین کی سرحدوں کی حفاظت ہی نہیں اس کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت بھی ہے۔

شدت پسندی کیا ہے؟

اب کچھ عرصے سے مسلم معاشرے کے مغرب زدہ حکمران طبقوں اور دینی عناصر میں کشمکش نے شدت اختیار کر لی ہے۔ اسلامی شدت پسندی کی اصطلاح پوری دنیا میں استعمال ہوتی ہے اور پہچانی جاتی ہے۔ اسلامی شدت پسندی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے مغرب اور مشرق کے حکمرانوں کی آواز ایک ہے۔ دنیائے اسلام کی حکومتیں یہ سوچے بغیر کہ شدت پسندی کیوں پیدا ہوئی؟ جو شدت پسند کہلاتے ہیں وہ کیا چاہتے ہیں؟ ان کے خیالات اور تصورات کیا ہیں؟ وہ اس راستے پر چلنے پر کیوں مجبوری ہوئے؟ یہ سب سوچے بغیر دنیائے اسلام کے حکمرانوں نے مغرب کا بتایا ہوا نسخہ آزمانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ سختی اور شدت کے ساتھ ریاست کی پوری قوت سے اس شدت پسندی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ شدت کا جواب مزید شدت سے دینا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ مزید شدت کی شکل میں نکلتا ہے اور یہ سلسلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مغرب کے کچھ بااثر حلقے یہی چاہتے ہوں اور دنیائے اسلام کو آپس میں ٹکرا کر تباہی کا شکار کر دینا چاہتے ہوں؟ (ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ)

دعوت و تبلیغ　　　　ارشد سراج الدین

قادیانی حضرات کو دعوتِ اسلام کیسے دی جائے؟

تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی؟

احمدی دوستوں کے لیے دعوتِ فکر

اس میں شک نہیں کہ سامراجی قوتوں نے اسلام کی فکری بنیادوں کو ہلانے کے لیے جو منظم سازشیں کیں قادیانیت ان میں سے ایک ہے۔ قادیانیت نے ختم نبوت کے بنیادی عقیدے پر ضرب لگا کر ملتِ اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہا لیکن الحمدللہ علماء کرام کی بروقت توجہ، مسلسل جدوجہد اور ایثار سے سامراج اس کوشش میں کامیاب نہیں ہونے پایا۔ اس سلسلے میں تمام مکاتبِ فکر کے علماءِ کرام نے علمی، عوامی اور قانونی محاذوں پر قادیانیت کو شکست دی۔ قادیانیوں کو پاکستان کے دستور کے تحت غیر مسلم قرار دیا جا چکا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ قادیانی عوام کو اسلام کے قریب لانے کی دعوتی حکمت عملی ترتیب دی جائے۔ قادیانیت ایک نہایت بودا اور کمزور مذہب ہے اور کسی بھی شائستہ اور مہذب انسان کو اگر اس مذہب کے بانی کی تحریریں پڑھا دی جائیں تو وہ زیادہ دیر تک اس مذہب کے ساتھ وابستہ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا ہمارے خیال میں قادیانی خواتین و حضرات کو قرآن کے دعوت و تبلیغ کے

اصولوں کی روشنی میں دعوت دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ایسا دعوتی لٹریچر بھی تخلیق ہونا چاہیے جس میں ان کی اَنا کو ٹھیس پہنچائے بغیر انہیں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہو۔ زیرِ نظر مضمون ایک ایسی ہی کوشش ہے۔ ہم چاہیں گے کہ اس مضمون کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہو اور کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے والے ہر قادیانی نوجوان تک اسے پہنچایا جائے۔ ادارہ

احمدی دوستو! آپ کا تعلق ایک ایسی جماعت سے ہے جو حقیقی دین اسلام پر قائم ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ آپ یقیناً اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں، کلمہ پڑھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور اپنی جماعت کی ترقی کے لیے اپنی محدود آمدنی کے باوجود مالی طور پر ساری زندگی قربانی دیتے رہتے ہیں۔ آپ ذوق و شوق سے اپنے مربی حضرات کی باتیں سنتے ہیں۔ آپ دینی عقیدت کے جذبے سے اپنے خلیفہ صاحب کی ہر بات مانتے ہیں کیونکہ یہ بات آپ کے دل میں جاگزیں کر دی گئی ہے کہ آپ کے خلیفہ خدا کا انتخاب ہیں۔ آپ جب اپنے اردگرد نظر ڈالتے ہیں تو عام مسلمانوں کی تباہ حالی اور زوال میں آپ کو اپنی جماعت کا منظم ماحول اور بھی دلکش دکھائی دیتا ہے۔ دہشت گردی اور فرقہ واریت کے واقعات کا سہارا لے کر آپ کو بتایا جاتا ہے کہ حقیقی اسلام صرف جماعت احمدیہ کے پاس ہے جو پوری دنیا میں پھیل رہی ہے اور بہت جلد یہ دنیا مسیح موعود اور مہدی زماں کو پہچان لے گی اور حقیقی اسلام یعنی احمدیت کو قبول کر لے گی۔ آپ کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ''جاہل ملا'' محض اپنی تنگ نظری اور ذاتی مفادات کی وجہ سے عوام الناس میں احمدیت کا غلط تعارف کراتا ہے۔ وہ مرزا صاحب کی کتابوں کے غلط اور سیاق و سباق سے کاٹ کر حوالے دیتا ہے اور یوں عوام کو گمراہ کرتا ہے۔ یہ ''مولوی'' معاشرے میں نفرت پھیلاتے ہیں جب کہ جماعت احمدیہ 'سب کے لیے محبت اور نفرت کسی سے نہیں' (Love for all and hatred for none) جیسے اصول کا پرچار کرتی ہے۔ آپ کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ جماعت احمدیہ پر جو دنیا میں مشکلات آتی ہیں اور احمدی افراد کا جو سماجی بائیکاٹ کیا جاتا ہے وہ جماعت کی سچائی کی دلیل ہے کیونکہ ہر دور میں اہلِ حق کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔

یہ سب کچھ آپ کو اپنے اطمینان کے لیے کافی دکھائی دیتا ہے اور آپ اپنے آپ کو ایک سچی جماعت کا فرد سمجھتے ہیں اور کسی تحقیق و تفتیش کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

لیکن کیا آپ واقعی مطمئن ہیں؟

- کیا جماعت احمدیہ کا نظام جو انسانوں کو معاشرتی اور نفسیاتی طور پر کنٹرول کرنے کے جدید ترین نسخوں اور ترکیبوں پر مبنی ہے، آپ کے ذہن میں چند سوالات کو جنم نہیں دیتا؟

- کیا پوری امت مسلمہ کا جماعت احمدیہ کے متعلق موقف اور اتنا بڑا اجماع (Consensus) محض تنگ نظری اور تعصب ہے؟ کیا آپ نے ملت اسلامیہ کا موقف جاننے کی دیانتدارانہ کوشش کی ہے؟

- یا کیا آپ اس لیے احمدی ہیں کہ آپ کے دادا یا پردادا نے مرزا صاحب کی بیعت کر لی تھی اور بس؟

- کیا آپ اپنے دل کے اضطراب اور شک کو زبان پر لانے سے اس لیے خوفزدہ ہیں کہ آپ کو جماعت سے خارج کر دیا جائے گا؟

- کیا آپ کے نزدیک ایمان جیسی اعلیٰ و ارفع قلبی کیفیت کی بنیاد خوف اور نفرت پر رکھی جاسکتی ہے؟

احمدی دوستو! اگر آپ اپنے خالق و مالک پر یقین رکھتے ہیں اور اس بات کو سچ مانتے ہیں کہ آپ بہت جلد اسے ملنے والے ہیں تو آپ سچائی کی دیوانہ وار تلاش اور سچ اور جھوٹ میں فرق کے لیے گہری تحقیق اور چھان پھٹک سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ آپ اطمینان کا ایک مصنوعی خول چڑھا کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ جماعت احمدیہ سے باہر تمام علماء محض مفاد پرست اور جھوٹے ہیں اور ہم ان کی کوئی بات نہیں سنیں گے اور جماعتِ احمدیہ کی قیادت کی اندھی تقلید میں اپنی قیمتی زندگی گزار دیں گے۔ یاد رکھیے سچائی انفرادی کیریئر اور سماجی رشتوں سے زیادہ اہم ہے۔

آپ کا یہ کہنا کہ ''بس جی! ہم میں اور غیر احمدی مسلمانوں میں کوئی خاص فرق نہیں، ہم بھی کلمہ پڑھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں''۔ آپ کی معصومیت بھی ہو سکتی ہے لیکن جن لوگوں نے یہ معصومیت آپ کو سکھائی ہے وہ نہیں چاہتے کہ آپ خود تحقیق کرنا شروع کر دیں، وہ نہیں چاہتے کہ آپ سچائی کی تلاش کے سفر پر نکلیں۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ مذہبی عقیدت کے نشے میں چُور رہیں تاکہ کبھی اصلی اور جعلی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا نہ کر سکیں۔

انٹرنیٹ پر جو لوگ سنجیدگی اور دیانتداری سے احمدیت کا تجزیہ کرتے ہیں، آپ کو اس طرح کی ویب سائٹس سے دور رہنے کا کہا جاتا ہے۔ جو لوگ احمدیت چھوڑ کر اسلام قبول کرتے ہیں، ان کے خلاف پراپیگنڈا کر کے انہیں آپ کی نظروں میں گرانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ احمدی عقائد اور جماعت کے نظام پر ان کی ریسرچ آپ کے علم میں نہ آ سکے۔

قارئین کرام! دنیا کی اس منڈی میں ہر اصلی چیز کے مقابلہ میں جعلی اور نمبر دو چیز موجود ہے۔ جعلی چیز اپنے رنگ و روغن اور پیکنگ سے اصل کے عین مطابق دکھائی دیتی ہے بلکہ بعض اوقات تو اپنی چمک دمک میں اصل سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر ہم نمک اور ہلدی خریدتے وقت تو پوری چھان بین کریں کہ خالص اشیاء کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہیں اور اپنے عقائد و افکار کے معاملے میں اپنے ذہن کو بند کر لیں اور اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اور سچ اور جھوٹ میں فرق جاننے کے لیے نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ منظم جدوجہد نہ کریں تو یقیناً یہ منافقت کا راستہ ہوگا۔ اگر ہم سچائی اور حقیقت کو اپنی زندگی کی اساس بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے قلب و ذہن کی تمام توانائیوں کو سچ جاننے کے لیے وقف کر دینا چاہیے اور اس سلسلہ میں ہر طرح کے ایثار و قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

احمدی خواتین و حضرات! آپ کو چاہیے کہ مرزا غلام احمد صاحب کی ''تمام'' کتابیں آپ خود پڑھیں صرف سلیکٹڈ سٹڈی کافی نہیں۔ ان میں موجود تضادات (Contradictions) کو نوٹ کریں۔ اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور ان علماء و مفکرین کا مطالعہ کریں جنہوں نے مرزا صاحب کی تصانیف اور احمدیت کا گہرائی اور بصیرت کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، جیسے پروفیسر الیاس برنیؒ، مولانا ابوالحسن ندویؒ، ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، مولانا منظور نعمانیؒ، ڈاکٹر غلام برق جیلانیؒ، پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ، مولانا یوسف لدھیانویؒ۔ انٹرنیٹ پر احمدیت کی آفیشل ویب سائٹ www.alislam.org کو ضرور دیکھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری ویب سائٹس پر موجود کتابوں، مضامین اور مباحث کا بھی غور سے مطالعہ کریں جیسے

www.ahmedi.org
thecult.info/blog
www.endofprophethood.com
www.khatmenubuwwat.org
www.irshad.org
www.youtube.com/user/akshaikhlover1

آپ کو سچائی تک پہنچنے کے لیے مسئلے پر تحقیق کرنا ہوگی اور بنیادی بات ہے مرزا غلام احمد صاحب کی زندگی، ان کی شخصیت اور ان کے دعاوی (Claims) کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ آپ کو غیر جانبداری سے ان کی شخصیت اور ان کے بتدریج (gradual) کیے جانے والے دعوؤں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ جس ماحول میں آپ پلے بڑھے ہیں اس نے مرزا صاحب کی ایک خاص تصویر آپ کے ذہن میں بنا دی ہے لیکن ایک ہے مرزا صاحب کا وہ امیج (Image) جو معاشرتی عمل (Socialization) کے نتیجے میں آپ

کے ذہن میں ہے اور ایک ہیں وہ حقیقی مرزا صاحب جو انیسویں صدی کے قادیان میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۸ء میں لاہور میں فوت ہوئے۔آپ کے ذہنی تصور کے مرزا صاحب اور حقیقی مرزا صاحب میں فرق ہوسکتا ہے۔آپ کو حقیقی مرزا صاحب تک پہنچنے کے لیے ان تمام کتابوں (صرف چند پمفلٹس نہیں) کا بغور اور خدا خوفی کے ساتھ مطالعہ کرنا ہوگا اور جماعت احمدیہ کے نظام پر غور کرنا ہوگا جس پر مرزا صاحب کے خاندان کا راج ہے۔

آپ کو ان احمدی خواتین وحضرات کے بارے میں جاننا چاہیے جنہوں نے پوری تحقیق کے بعد بال آخر احمدیت سے توبہ کر لی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین قیم کو اختیار کر لیا۔ مثلاً ملک محمد جعفر خان، سیف الحق (جرمنی)، رفیق احمد باجوہ، محترمہ بشریٰ باجوہ، شیخ راحیل احمدؒ، اکبر چوہدری، شاہ کمال احمد، زیڈ اے سلہری، عرفان محمود برق (لاہور) اور طاہر منصور (اسلام آباد) وغیرہ۔

یقیناً تحقیق اور سچائی کی جستجو کا یہ راستہ آپ کے لیے مشکلات لاسکتا ہے۔ہوسکتا ہے آپ کے سوالات کا مذاق اڑایا جائے یا پھر آپ پر شک کیا جائے، آپ کو دھمکیاں دی جائیں اور پھر آپ کو جماعت سے ہی خارج کر دیا جائے لیکن یاد رکھیے سچائی اور ہدایت اتنی کم مایہ چیز نہیں کہ تھوڑے سے سماجی دباؤ میں آکر کوئی اس سے دستبردار ہوجائے۔علم اور تحقیق کی روشنی سے ڈرنا بزرلوں کا شیوہ ہے۔

بظاہر احمدی اور غیر احمدی ایک ہی کلمہ پڑھتے ہیں لیکن درحقیقت ان کے عقائد میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ایک اگر دن ہے تو دوسرا رات ہے۔ان دونوں گروہوں مین سے صرف ایک ہی سچائی پر ہے اور دوسرا لازماً گمراہی پر ہے۔احمدی دوستو! آپ ان اختلافات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔آپ کو اخلاص کے ساتھ تحقیق کرنا ہوگی۔آپ اپنے آپ کو صرف MTA کے پروگراموں، اپنے جلسوں اور کتابچوں کے مطالعے تک ہی محدود نہیں کر سکتے۔آپ کو بتایا جاتا ہے کہ احمدیت کے خلاف طوفان محض چند فرقہ پرست مولویوں نے اٹھا رکھا ہے۔آپ کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اگرچہ علماء پر تنگ نظری کا الزام لگایا جاتا رہا ہے تاہم تاریخ گواہ ہے کہ صوفیاء اور درویش اس الزام سے ہمیشہ بری رہے ہیں۔اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام نے ہمیشہ اخلاق، رواداری اور محبت سے لوگوں کے دل جیتے۔سچائی کے ایک متلاشی کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ احمدیت کے متعلق صوفیائے کرام نے کیا ردعمل ظاہر کیا؟ اور وہ اس جماعت کے عقائد اور طرزِ عمل کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے تمام سلاسل اور خانقاہوں کا احمدیت کے متعلق موقف بڑا واضح

رہا ہے۔ وہ اپنے تمام اخلاق اور رواداری کے باوجود احمدیت کو دائرہ اسلام سے باہر سمجھتی ہیں بلکہ احمدی مذہب پر علمی تنقید کا آغاز گولڑہ شریف کے ایک چشتی بزرگ نے ہی کیا تھا۔ اسی طرح وہ مفکرین اور محققین جو نہ صرف اسلام پر گہری نظر رکھتے تھے بلکہ فلسفہ تاریخ اور انسانی علوم (Humanities) کے بھی ماہر تھے جیسے علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، پروفیسر غلام جیلانی برق اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور ان کے علاوہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججز اور وکلاء اور پھر ملائیشیا اور انڈونیشیا سے لے کر مراکش اور جنوبی افریقہ تک پوری امت مسلمہ...... کیا یہ سب لوگ متعصب اور تنگ نظر ہیں اور مل کر کوئی سازش کر رہے ہیں؟

آپ انیسویں صدی کے پنجاب کے ایک گاؤں قادیان میں نہیں بلکہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس عہد میں موجود ہیں جہاں ہر چار گھنٹے میں علم دوگنا ہوجاتا ہے۔ آپ کو دوسرے لوگوں کی بات بھی سننا ہوگی۔ امتِ مسلمہ کے اہل علم، اہل دانش، اور اہل درد...... اگر یہ سب احمدیت کو گمراہی سمجھتے ہیں تو آپ کو محض چند لوگوں کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوجانا چاہیے۔ ایسا اطمینان خود کو دھوکہ اور فریب دینے کے مترادف ہوگا۔

بھول بھلیوں میں ڈالنے والے راستوں سے بچیے اور اسلام کی مرکزی شاہراہ پر واپس آجایئے۔ وہ شاہراہ جس پر نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم اور امت کے صالحین نے چل کر دکھا دیا۔ وقت آگیا ہے کہ آپ اپنے ذہن کے دریچے کھولیں اور کھلی ہوا میں سانس لیں۔ سچا دین وہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور اس دین کی تکمیل کا اعلان خالق کائنات نے کر دیا۔ اب کسی شخص کے الہام اس دین میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ دین کی ان سیدھی تعلیمات کے مقابلہ میں ہر منطقی الجھاؤ محض مغالطہ (fallacy) ہے۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہئے کہ جہاں مجدّدین اور مصلحین آتے رہے ہیں وہیں کاذب اور جھوٹے دکانداروں کا سلسلہ بھی چلتا آرہا ہے اور یہ جھوٹے لوگ اپنے پیروکاروں کی اچھی خاصی جماعت بھی بناتے رہے ہیں۔ مستند (authentic) اور سچے دین کی پیروی ہی میں نجات ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔ ہم براہ راست ان کے امتی ہیں۔ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی وجہ سے اب ایسے منصب پر فائز ہوگیا ہوں کہ لوگوں کو اب میری اطاعت کرنا ہوگی، میری شخصیت بھی تسلیم کرنا ہو گی وہ دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا باغی ہے۔ مسیلمہ کذّاب بھی کلمہ پڑھتا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بھی مانتا تھا لیکن خود بھی نبوت کا دعویدار تھا اسی لیے ملت اسلامیہ سے خارج ہوا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف جہاد کیا۔

احمدی خواتین وحضرات! آپ کو کسی مشین کا کوئی پرزہ نہیں بننا چاہیے جس میں ایک سافٹ وئیر ڈال دیا گیا ہو۔ آپ اپنے پوٹینشل کے اعتبار سے ایک باشعور اور صاحب بصیرت انسان ہیں لیکن اس پوٹینشل کو ایکچولائز (actualize) کرنے کے لیے آپ کو ہمت اور کوشش کرنا ہوگی۔ اپنی زندگی کے کسی حصے میں یہ بات آپ پر کھل جائے گی کہ آپ ایک ایسے قلعے میں بند ہیں جہاں آزاد فضا میں جانے والے ہر راستے کو خاردار تاروں اور کھائیوں سے بھر دیا گیا ہے۔ یہ آپ کو باہر جانے سے روکتی ہیں۔ لیکن ان خاردار تاروں سے زیادہ خطرناک آپ کے ذہن کی وہ پروگرامنگ (programming) ہے جو باہر کے ہر خوبصورت منظر کو آپ کی نظروں کے لیے بھیانک اور قلعے کے عین اندر موجود تعفن اور گھٹن کو آپ کے لیے خوبصورت بنا دیتی ہے اور یوں آپ اپنی مرضی سے خود کو ایک ایسے نظام کے حوالے کر دیتے ہیں جس کی بنیاد جبر اور دھوکے پر ہے اور جو آپ کا روحانی استحصال بھی کرتا ہے اور معاشی بھی۔

انسانی گروہوں کے ساتھ بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ان کے قلب ونظر غلامی اور جبر کے اتنے خوگر ہو جاتے ہیں کہ وہ اسی کو اپنی نجات اور آزادی کا راستہ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کو آزادی کے عنوان پر غلام بنالیا جاتا ہے، محبت کے عنوان پر دلوں میں نفرت پیدا کی جاتی ہے، اسلام کے عنوان پر کفر کو فروغ دیا جاتا ہے اور ختم نبوت کے عنوان پر نبوت کو جاری کر دیا جاتا ہے۔ یقینا یہ سچائی کے ساتھ ایک مذاق اور انسانیت کے ساتھ ایک دھوکہ ہے۔ اخلاص، شعور اور دیانتداری پر مبنی تحقیق اور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی دعا ہی جھوٹ اور جبر کے سیاہ بادلوں تلے چھپے ہوئے سچائی اور ہدایت کے آفتاب کو پہچاننے میں ہماری مدد کر سکتی ہے!

اے اللہ! تو ہمیں حق کو حق ہی دکھا، اور ہمیں اس کی پیروی نصیب کر۔ اور ہمیں باطل کو باطل ہی دکھا، اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الحَقَّ حَقًّا وَّ ارزقنا اتباعه و ارنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابه بر حمتك يا ارحم الراحمين

اے اللہ! تو ہمیں حق کو ہی حق دکھا اور ہمیں اس کی پیروی نصیب کر اور ہمیں باطل کو باطل ہی دکھا، اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔ (آمین یارب العالمین)

لذت کی خاطر گناہ مت کرو کیونکہ

لذت ختم ہو جائے گی اور گناہ باقی رہ جائے گا

اور

مشقت کی خاطر نیکی مت چھوڑو کیونکہ

مشقت ختم ہو جائے گی اور نیکی باقی رہ جائے گی

(امام غزالیؒ)

میڈیا ملک احمد سرور

پاکستان کا کرپٹ الیکٹرانک میڈیا

مسلمانوں کے خلاف مغرب کی 'میڈیا وار' عروج پر ہے جس کا ایک مظہر پاکستان کی زرداری صاحب کی زیر قیادت مغرب کی غلام حکومت میں پاکستان کا الیکٹرانک میڈیا ہے جس کی موثر اکثریت ہمارے دوست ملک احمد سرور صاحب کے تجزیے کے مطابق کرپٹ، حریص، بے ضمیر، جھوٹے، فحاشی کے علم بردار، بکے ہوئے اور مغرب اور اس کی ایجنسیوں کے زرخرید اور فکری سطح پر غلامانہ ذہنیت کے حامل افراد پر مشتمل ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کی اصلاح کس کی ذمہ داری ہے؟ مدیر

'صحافت' ایک انتہائی مقدس پیشہ تھا جو حرص و ہوس کے باعث شیطانی عفریت کا روپ دھار چکا ہے۔ چند دہائیاں قبل صحافیوں کی اکثریت قلم کی حرمت کی پاسبان تھی، اگرچہ اس دور میں بھی بڑی تعداد میں صحافی سیاسی و مذہبی جماعتوں اور ایجنسیوں سے رقوم لیتے تھے۔ اس صحافت کو ''لفافہ صحافت'' کہا جاتا ہے۔ پُرتکلف ریفریشمنٹ رلنچ ڈنر تو ہر صحافی اپنا حق سمجھتا ہے مگر سرکاری ملازم کے لیے ایسا کچھ بھی 'رشوت'

میں شمار ہوتا ہے۔ پھر پلاٹوں کی تقسیم شروع ہوئی تو ہر سکیم میں صحافیوں کا کوٹہ رکھا جانے لگا۔ ہر بااثر صحافی نے ایک سے زائد ہی پلاٹ لیے۔ بڑے صحافیوں کو بڑے بڑے پلاٹ ملے۔ گزشتہ سال ایک سینئر موسٹ بابا صحافی کی سوشل میڈیا میں آڈیو ریکارڈنگ آ گئی۔ اس سے ایک جونیئر صحافی نے متعدد بڑے بڑے پلاٹ لینے کا پوچھا تو جواب میں وہ فحش گالیاں سنیں کہ بازارِ حسن کے دلال نے بھی کبھی نہ بکی ہوں گی۔ آہستہ آہستہ یہ حقیقت کھلتی چلی گئی کہ بظاہر عوام کے ہمدرد بڑے بڑے صحافی اور ٹی وی اینکرز سب پلاٹ خور ہیں، اپنے کالموں اور ٹی وی ٹاکس میں محض اداکاری کرتے ہیں۔ رائے عامہ بنانے والے ان تمام بڑے صحافیوں اور ٹی وی اینکرز نے ہر طرف سے مال بنایا ہے۔ امریکہ سے ڈالر لے کر ’جہاد اور اسلام‘ کے بارے میں قوم کو گمراہ کیا اور ملت اسلامیہ کے حقیقی ہیروز کی کردار کشی کی۔ ٹھیکیدار ملک ریاض نے ان کو مزید ننگا کر دیا ہے۔ اب ایک اور رپورٹ سامنے آ گئی ہے کہ جن صحافیوں کو پلاٹ نہیں ملے انہوں نے حکومت سے سیاحتی پارکوں اور دیگر جگہوں پر ’’کھوکھے‘‘ لینے شروع کر دیے۔ یہ کھوکھے لے کر وہ فروخت کر دیتے ہیں یا کرائے پر چڑھا دیتے ہیں۔ یقیناً شعبۂ صحافت سے دیانتدار لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد وابستہ ہے لیکن صحافیوں کے بارے میں جو کچھ سامنے آ چکا اور آ رہا ہے، اس سے یہی تاثر نمایاں ہوتا ہے کہ تمام ممتاز (ایک آدھ استثناء ہوسکتا ہے) صحافی اور ٹی وی اینکرز حرص و ہوس میں غرق ہو چکے ہیں اور شیطان کی اقتدا میں بنی نوع انسان کو گمراہ کر رہے ہیں۔

اگر چہ یہ صحافی اپنی اپنی صفائی میں بہت کچھ کہہ رہے ہیں مگر ہر مجرم اپنی صفائی میں ایسے ہی دلائل دیتا اور شہادتیں پیش کرتا ہے۔ ایک بدنام زمانہ طوائف کو بھی میڈیا پر لے آئیں تو وہ بھی اپنے کو فرشتہ ثابت کرنے کے لیے بہت کچھ کہے گی۔ کرپٹ صحافیوں کا یہ ٹولہ کذابوں کا ٹولہ ہے اور اس ٹولے کے صحافی اپنی صفائی میں جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں جھوٹ ہی کہہ رہے ہیں۔ قوم نے ان کو پڑھنا نہ چھوڑا اور ان کو مسترد نہ کیا تو یہ پہلے سے بھی بڑھ کر گمراہی پھیلائیں گے۔ یہ کرپٹ حکمرانوں اور کرپٹ بیوروکریسی سے بھی زیادہ عوام دشمن اور خطرناک ہیں (بشکریہ بیدار ڈائجسٹ)۔

برما کے مسلمان

فلسطین، کشمیر، چیچنیا کے بعد اب برما کے مسلمان بھی ظلم وستم کی چکی میں پس

رہے ہیں۔ مسلم امت ۵۷ ممالک میں منقسم ہے اور اس کے عالمی ادارے مثلاً اسلامی کانفرنس تنظیم (او آئی سی)، رابطہ عالمِ اسلامی اور موتمر عالمِ اسلامی وغیرہ مغرب کے دیے ہوئے انجکشن کے نتیجے میں آرام سے سورہے ہیں جب کہ

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

میڈیا

مولانا عیسیٰ منصوری ☆

مسلمانوں کے خلاف مغرب کی میڈیا وار

روس کی شکست وریخت کے بعد مغرب سمجھ رہا ہے کہ اب دنیا میں مغرب کی بالادستی کی راہ میں واحد رکاوٹ اسلام ہے۔ اسے اس بات کا بھی خوف ہے کہ اگر دنیا کے کسی خطے میں اسلام اپنی صحیح ہیئت کے ساتھ نافذ ہوگیا تو کمیونزم کی طرح مغربی نظام حیات (ویسٹرن سویلائزیشن) بھی ریت کی دیوار کی طرح ڈھے جائے گا۔ اس خوف سے مغرب دنیا کی اسلام دشمن طاقتوں کو ساتھ ملا کر اسلام کے مقابلہ پر صف آرا ہوگیا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام پر کاری ضرب لگانے یا اسے ختم کرنے کا تاریخ میں ایسا سنہری موقع اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ آج کے دور میں اسلام پر مغرب کا یہ حملہ ایک نئے رخ سے ہے جسے ہم میڈیا وار کہہ سکتے ہیں۔ درحقیقت آج کا دور میڈیا کا دور ہے۔ اس کی طاقت ایٹم بم سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ میڈیا لاکھوں کروڑوں انسانوں کے ذہن ودماغ کو جس طرف چاہے موڑ دیتا ہے۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ مغرب محض موثر اور طاقتور میڈیا کے ذریعہ ہمارے ذہنوں پر حکومت کررہا ہے۔ وہ میڈیا کے ذریعہ ہماری سوچ کر متاثر کرتا ہے اور منصوبے کے تحت اسے خاص رخ پر ڈالتا ہے۔ یہ دور جسمانی غلامی کا نہیں، ذہنی غلامی کا ہے۔ ماضی میں جب ضعیف قوموں کو غلام بنایا جاتا تھا، تجارتی مقاصد کے لیے کمزور ملکوں کو نوآبادی اور کالونی بنایا جاتا تھا، اس وقت مغرب نے ایشیائی وافریقی عوام کو غلام بنا

لیا تھا۔ اس دور میں آپ کو کہیں انسانی حقوق کا ذکر نہیں ملے گا کیونکہ انسانی حقوق کا فلسفہ مغربی استعمار کے مفادات کی نفی کرتا تھا۔ جب مغرب کی استعماری قوتوں کو آزادی کی تحریکوں کے آگے ہتھیار ڈال کر غلام ممالک سے رخصت ہونا پڑا تو اس کے ساتھ ہی انہیں ڈیموکریسی و جمہوریت اور انسانی حقوق کا خیال آ گیا تا کہ اس راہ سے بھی کمزور اقوام کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا موقع مل سکے۔ اب مغرب نئی تیاریوں اور نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر سامنے آیا ہے۔ وہ جسم کے بجائے انسانی ذہنوں کو غلام بنانا چاہتا ہے۔ ذہنی غلامی، جسمانی غلامی سے کہیں زیادہ بدتر اور خوفناک ہوتی ہے اور اس دور میں ذہن و فکر کو غلام بنانے کا سب سے موثر ذریعہ میڈیا ہے۔ اس وقت سب سے اہم مسئلہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغربی میڈیا کی یلغار ہے۔ ادھر چند سالوں سے ہماری کمزوری، بے حسی اور غفلت کے سبب میڈیا کے راستے سے بھارت کی دیو مالائی تہذیب بھی حملہ آور ہو گئی ہے۔ شرک و بت پرستی، جس کے تصور سے بھی

☆ ورلڈ اسلامک فورم، برطانیہ

ایک مسلمان کو کانپ جانا چاہیے تھا، اللہ کے آخری پیغمبر کا ارشاد ہے ''اے ابو ذر، تیرے نزدیک شرک تیرے زندہ جلائے جانے اور جسم کے ٹکڑے کر دیے جانے سے زیادہ اشد اور خوفناک چیز ہو''۔ اب ریڈیو، فلموں، ٹی وی پروگراموں اور سیٹلائٹ کے ذریعہ ہماری نئی نسلوں کے ذہن سے شرک و بت پرستی کی شناعت اور نفرت کھرچ کھرچ کر ختم کی جا رہی ہے۔ یہی نہیں، مرزائی و قادیانی اسلام کے لبادے میں نئی نبوت کی دعوت اور ارتداد کی مہم پر سرگرم عمل ہو چکے ہیں۔ ہمیں نہ صرف میڈیا کے اس بے رحم حملے کو روکنا ہے بلکہ میڈیا کا متبادل فراہم کرنا بھی وقت کا سب سے بڑا مسئلہ ہے جس پر بحیثیت مسلمان ہمارے وجود و بقا کا دار و مدار ہے۔ اگر اب بھی ہم نے غفلت برتی تو تاریخ اور آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔

مغرب کا فکری حملہ

مسلمانوں کو ہر دور میں بڑے بڑے چیلنجوں کا سامنا رہا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں پر چودہ سو سالہ دور میں اتنا نازک وقت کبھی نہیں آیا تھا۔ بلاشبہ تاتاریوں کا حملہ ایک بہت بڑا حملہ تھا مگر اس کی نوعیت محض عسکری تھی اور چند ہی سالوں میں اسلامی تہذیب و علوم نے تاتاریوں کو دوبارہ فتح کر لیا تھا۔ اسی طرح اس صدی کے شروع میں کمیونزم کا حملہ ایک طاقتور فکری حملہ تھا۔ مگر اس کی نوعیت اصلاً اقتصادی تھی۔ یہ مغرب کے بے لگام سرمایہ دارانہ نظام کا ردعمل تھا مگر آج مغرب کا فکری حملہ تاریخ کا سب سے بڑا حملہ ہے جو ہمہ جہتی ہے۔ یہ حملہ فکری بھی ہے اور علمی بھی، اقتصادی اور معاشی بھی ہے، تمدنی و تہذیبی

بھی۔ یہ سیاسی بھی ہے اور عسکری بھی اور دنیا کے چپہ چپہ کو محیط ہے۔ روئے زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو اس کی یلغار اور دسترس سے محفوظ ہو۔ اسلامی تاریخ میں مغرب کے اس فکری حملے کی مماثلت کسی حد تک دوسری صدی ہجری میں یونانی علوم وفلسفے کی یلغار سے دی جاسکتی ہے۔ جب اسلام دنیا میں تیزی سے پھیل رہا تھا یونانی علوم وفنون، فکر وفلسفہ کو اسلام کی تیز رفتار ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ ان علوم کو ذہن وفکر کو الجھانے اور دلوں میں ایمان وایقان کی جگہ تذبذب وشکوک کے کانٹے بونے کے لیے استعمال کیا گیا تاکہ اسلام پر سے اعتماد کو متزلزل کر دیا جائے لیکن اس دور کا مسلمان علم میں آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا اور مسلم علماء ومفکرین کا ہاتھ زمانے کی نبض پر تھا۔ انہوں نے وقت کے چیلنج کو قبول کیا اور یونانی علوم میں مہارت حاصل کی۔ ان افکار ونظریات وفلسفوں کا تنقیدی جائزہ لیا، ان سے غیر اسلامی اجزا کو خارج کر کے ان علوم وفنون کو اسلام کا معاون ومددگار بنا دیا حتیٰ کہ آج یہ اسلامی علوم وفنون سمجھے جا رہے ہیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے کہ انہوں نے یونانی فلسفہ وفکر کو مسلمان بنایا۔ اگر گزشتہ چند صدیوں سے مسلمان پسماندہ نہ رہ گئے ہوتے اور علماء کا علم وسائنس کے دور سے رشتہ نہ کٹ گیا ہوتا تو مغربی افکار ونظریات کا دقت نظر سے تنقیدی جائزہ لیتے، ان سے فاسد اور مضر اجزاء کو علیحدہ کر کے انہیں اسلام کا معاون بنا لیتے۔

غیر جانبداری کا ڈھونگ

اس کائنات میں انسانوں کی حقیقت صرف ایک ہے اور وہ ایمان وکفر کی تقسیم ہے۔ ہر انسان مومن ہے یا کافر ہے، خالق کائنات کے نزدیک بھی، قرآن کے نزدیک بھی، تمام سماوی کتابوں کی رو سے بھی۔ آج بھی اور قیامت تک یہی سب سے بڑی اور قابل لحاظ تقسیم رہے گی۔ اس کے علاوہ دنیا میں انسانوں کی اور جتنی تقسیمیں ہیں، خواہ ملکی اور علاقائی بنیاد پر ہوں، قومی ونسلی بنیاد پر ہوں یا لسانی بنیاد پر، یہ سب غیر حقیقی اور انسانوں کی خود ساختہ ہیں یا اس درجہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ جس طرح اسلام کا مقصد دنیا سے شر اور کفر کو مٹانا ہے، اسی طرح دنیائے کفر کا اوّلین مقصد اسلام اور مسلمان کو ختم کرنا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہود کی ذہانت وذکاوت اور مغرب کے وسائل وطاقت اور برہمن کی مکاری وعیاری اسلام دشمنی میں متحد ہو چکی ہیں۔ یہ حقیقت ہے جس سے آج ہم میں سے بہت سے حضرات آنکھیں چراتے ہیں اور خود فریبی میں رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن حالات وواقعات اور قدرت کے تازیانے بار بار اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ میں ایک بات کی طرف خاص طور سے توجہ دلانا چاہتا ہوں جس کا مجھے گزشتہ چند دنوں میں کئی بار تجربہ ہوا۔ ہمارے بہت سے قابل احترام صحافی دوست ہر حالت میں غیر

جانبداری کو اپنا طرہ امتیاز سمجھتے ہیں۔ یقیناً غیر جانبداری بہت بڑی خوبی ہے۔قرآن مجید کی بھی تعلیم ہے ''کسی فرد یا قوم کی دشمنی وعصبیت تمہیں بے انصافی پر آمادہ نہ کرے''۔لیکن جہاں مسئلہ صحیح اور غلط کا ہو،حق وباطل کا ہو، ظالم ومظلوم کا ہو، وہاں غیر جانبداری سراسر ظلم ہے۔ وہاں اسلام کے تعلیم یہ ہے کہ انسان غیر جانبدار نہیں بلکہ حق وصداقت کا طرفدار رہے۔ میں سمجھتا ہوں اس طرح کی اندھی غیر جانبداری مغربی فکر وتعلیم کی دین ہے اور شاید اس کی ایک چال بھی کہ حق وباطل کے درمیان فرق وامتیاز کو ختم کر کے مسلمان کو غافل کر دیا جائے۔لیکن آپ دیکھیں گے کہ مغرب غیر جانبداری کا ڈھونگ رچا کر ہر جگہ اسلام کی خلاف ڈنڈی مار دیتا ہے۔ جب اور جہاں اسلام کا مسئلہ آیا، مغرب کی جانبداری عیاں ہوجاتی ہے۔اس کی ایک چھوٹی سی مثال پاکستان کے کمیشن برائے انسانی حقوق کی وہ رپورٹ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''پاکستان میں خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے بڑھنے کی وجہ اسلامی بنیاد پرستی کا بڑھتا ہوا رجحان ہے'' اسے مغربی میڈیا نے خوب اچھالا ہے۔آپ ذرا اس جملے کا تجزیہ کیجیے کہ اسلامی بنیاد پرستی کے رجحان کا کیا مطلب ہے؟'' انسان کا مذہبی ہونا، شریعت کا پابند ہونا۔جس شخص کو آخرت اور یوم الحساب کا خوف ہو وہ ایسے فعل کا تصور بھی نہیں کرسکتا کجا یہ کہ دینداری کو وجہ اور سبب قرار دیا جائے۔خواتین کے ساتھ زیادتی کے بڑھتے ہوئے واقعات کے حوالے سے میڈیا کا یہ جملہ کتنا خوفناک ہے؟ اس میں اسلام کا کیا تصور ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے؟ میڈیا نے ایک چھوٹے سے جملے سے اسلام کے خلاف کس قدر زہر ذہن میں بھرنے کی کوشش کی ہے۔

سیکولرزم کا طوطی

اس وقت دنیا میں دو فکروں کا تصادم برپا ہے۔ ایک اسلامی فکر دوسرے مغربی فکر۔ مغربی فکر کا خلاصہ دو لفظوں میں دین وسیاست کی علیحدگی سے کیا جاسکتا ہے یعنی سیکولرزم مغرب کے نزدیک مذہب خالصتاً ایک نجی اور پرائیویٹ معاملہ ہے، اس کے نزدیک مذہب کی حدود عقائد وعبادات پر ختم ہو جاتی ہیں، اسے کسی اجتماعی مسئلہ میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے جبکہ اسلام اس تفریق کا قائل نہیں ہے۔ وہ انسان کی ہر انفرادی واجتماعی مسئلے میں رہنمائی کرتا ہے۔ فرد، معاشرہ، سیاست، معیشت، نظام حکومت، بین الاقوامی تعلقات تک کے احکام وفرائض دیتا ہے اور ضابطے مقرر کرتا ہے۔ وہ انفرادی واجتماعی کسی مسئلے میں انسان کو بے لگام نہیں چھوڑتا۔ مغرب ''گاڈ''(God) کو مسیح کو اور بائبل کو مانتا تو ہے مگر صرف اس حد تک کہ مسیح کو خدا کا بیٹا مان لینا ہی نجات کے لیے کافی ہے۔ باقی وہ مسیح کو، ان کی لائی ہوئی شریعت وکتاب کو حتیٰ کہ مسیح کے باپ کو یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں کہ وہ اجتماعی مسائل یعنی سیاست، معیشت

واقتصادیات، معاشرت، نظم ونسق وقانون میں دخل اندازی کرے۔ مغرب کے اس فکر وفلسفے کی جڑیں یورپ کی گزشتہ چارسو سالہ تاریخ میں پیوستہ ہیں۔ یورپ کے عوام ہزارہا سال سے بادشاہت و مذہبی پادریوں کے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔ سولہویں صدی عیسوی میں جب یہاں علم وسائنس اور ٹیکنالوجی کا دور شروع ہوا اور یورپ کا انسان بیدار ہونے لگا اور اس نے قدرت کے مخفی خزانوں کا انکشاف اور اس کی تسخیر شروع کی، اس وقت یہاں کے مذہبی رہنماؤں نے اپنی عاقبت نااندیشی سے علم وسائنس سے انکار کی راہ اختیار کی۔ یورپ کے اس دور کی مذہب وسائنس کی کشمکش کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے مذہبی رہنماؤں نے احتساب کی عدالتیں قائم کرکے ہزار ہا انسانوں کو ان کے علمی نظریات کی بنیاد پر، جیسے زمین کا گول ہونا، حرکت کرنا یا اس میں کشش کا ہونا، اذیت ناک سزائیں دیں اور انہیں زندہ جلایا، سولی چڑھایا۔ پادریوں کے اس علم دشمن رول کی وجہ سے یہاں کے عوام کے دلوں میں مذہب کے خلاف ایک طرح کا عناد جڑ پکڑ گیا کہ مذہب علم وسائنس کا، دنیاوی ترقی و بہبود کا دشمن ہے۔ میں مذہب کے خلاف اس بدگمانی میں یورپ کی اقوام کو بڑی حد تک معذور سمجھتا ہوں۔ توقع تھی کہ آہستہ آہستہ یہ زخم بھر جائے گا اور نفس مذہب کے خلاف جو نفرت وعناد پیدا ہوگیا ہے، وہ وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو جائے گا لیکن اس دوران یہاں ایک اور شاطر وعیار طبقہ سامنے آگیا جس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مذہب دشمنی کی چنگاری کو ہوا دینی شروع کی تاکہ مذہب دشمنی کی آگ پر اپنے مفادات کی روٹیاں سینک سکے اور خداوند مذہب کی جگہ اپنا اقتدار قائم کرسکے۔ یہ طبقہ تھا نسل پرست صیہونیت اور یہاں کی اشرافیہ کا۔

علماء کی کم نگاہی

یہ انسان کی بدنصیبی تھی کہ گزشتہ صدیوں میں دنیا کے بیشتر حصہ پر اور عالم اسلام پر یورپ کی حکمرانی رہی۔ اس نے تعلیم، ابلاغ اور تمام وسائل بروئے کار لاکر اس مغربی فکر کو ذہنوں میں اس طرح راسخ کردیا کہ مسلم دنیا کا کوئی طبقہ اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا حتیٰ کہ علماء کا طبقہ جن کا استعمار دشمنی اور اخلاص وطن کی راہ میں جہاد وقربانی کا نہایت شاندار اور عظیم ریکارڈ ہے، وہ بھی غیر شعوری طور پر اس فکر کا شکار ہوگیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دینی مدارس وجامعات میں فقہ وحدیث کے درس میں استاد کا پورا زور بیان اور تحقیق عقائد وعبادات پر رہتا ہے۔ کتاب الطہارت سے کتاب الحج تک، زیادہ زور مارا تو کتاب النکاح وکتاب الطلاق۔ حالانکہ احادیث وفقہ کی انہی کتابوں میں کتاب البیوع بھی ہے، کتاب الاجارہ، کتاب الامارہ بھی، کتاب المزارعہ بھی اور قضا، سیاست اور مملکت کے متعلق ابواب بھی۔ مگر ہم ان سے اس طرح

گزر جاتے ہیں گویا یہ سب منسوخ ہو چکے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں علماء نے جس دشمن کے خلاف جہاد شروع کیا تھا، ان کے بعد والوں نے اسی فکر کو گلے لگا لیا۔ ایک عزیزی نے گزشتہ دنوں ایک نومسلم دوست کا تجزیہ مجھ سے بیان کیا جو مجھے بہت پسند آیا۔ انہوں نے کہا کہ برصغیر میں ۱۸۵۷ء میں مسلم حکمرانوں اور علما نے انگریز سے جو شکست کھائی، اس وقت علما نے محسوس کر لیا تھا کہ عسکری میدان میں انگریز کی قوت کا مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ اگر مزید میدان میں ٹھہرے تو انگریز کچل کر ختم کر دے گا۔ انہوں نے وقت کی حکمت عملی کے تحت دیوبند، گنگوہ جیسے چھوٹے قصبات میں دینی مراکز قائم کیے تاکہ جتنا دین بچایا جاسکے، بچا لیا جائے۔ چنانچہ وہ دینی علوم وفنون، اسلامی معاشرت وتمدن اور ایک مسلمان کا خدا و مذہب سے تعلق باقی رکھنے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ اگرچہ ان کے پیش نظر افراد سازی اور بھرپور تیاری کر کے دوبارہ میدان میں آنا تھا۔ مگر بعد کے حالات نے انہیں فرصت نہیں دی۔ ان علما کے میدان چھوڑنے سے جہاں یہ فائدہ ہوا کہ ہندوستان دوسرا اسپین بننے سے بچ گیا، وہیں سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ علما کا طبقہ زمانے سے کٹ گیا۔ علم وفکر کا قافلہ ۱۸۵۷ء میں جہاں تھا، یہ اب تک اسی بارڈر پر ہے۔ اس ڈیڑھ صدی میں علم وسائنس اور صنعت وٹیکنالوجی نے جو بے مثال ترقی کی ہے، یہ اس سے بے بہرہ ہو گئے جس کی وجہ سے زمانے کو سمجھنے کی بصیرت اور شعور گھٹتا چلا گیا لیکن ہمیں اعتراف کرنا چاہیے، آج جتنا علم ودین باقی ہے حتیٰ کہ یہاں مغرب میں بھی مساجد ومدارس کا جال پھیلا ہوا ہے، یہ سب انہی حضرات کی سعی وکاوشوں کا ثمر ہے۔

مغربی تہذیب روبہ زوال ہے

آج دنیا میں تصادم دو فکروں کا ہے اور بظاہر مغربی فکر ہر طرح حاوی اور غالب توانا وطاقتور ہے لیکن اہل بصیرت سے مخفی نہیں کہ مغربی فکر وتہذیب اپنی طبعی عمر پوری کر چکی ہے۔ عرصہ سے اس کا کھوکھلا پن نمایاں ہو چکا ہے۔ اس کے اندر انسانیت کو مزید کچھ دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ بقول شاعر مشرق علامہ اقبال ''یہ تہذیب اپنے ہی خنجر سے خودکشی کرنے پر تلی ہوئی ہے'' یہی وجہ ہے کہ یہاں کے مفکرین اور دانشور ہی نہیں، آپ کا پرائم منسٹر بھی بنیادوں کی طرف واپسی کی مہم چلانے پر مجبور ہے۔ کہاں تو اسلام کے خلاف بنیاد پرستی کی گالی وضع کی تھی اور کہاں بنیادوں کی طرف واپسی کی مہم چل پڑی۔ علامہ اقبال نے یورپ کے آخری سفر سے واپس جاتے ہوئے فلسطین کے خطاب میں ایک فکر انگیز بات فرمائی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا ''پوری انسانیت کی آخری پناہ گاہ بالآخر اسلام ہی ثابت ہوگا۔ یہ بات مغرب جتنی جلدی سمجھ لے، اس کے لیے بہتر ہے اور مشرق کے لیے بھی'' ۔ ایک جگہ علامہ نے لکھا ہے کہ ''میں نے

تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے میں نے یہ عجیب بات دیکھی کہ جب کوئی نازک وقت آیا تو اسلام نے آگے بڑھ کر مسلمان کی حفاظت کی۔ مسلمان نے کبھی اسلام کی حفاظت نہیں کی۔'' علامہ اقبال کہا کرتے تھے اس دور کا مجدد کہلانے کا وہی شخص مستحق ہوگا جو اسلامی شریعت کی برتری ثابت کرے اور زندگی سے اس کا پیوند لگائے اور ثابت کرے کہ اسلامی قانون وضعی قانون اور انسانوں کے تمام خود ساختہ قوانین سے آگے کی چیز ہے۔ زمانہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ دنیا نے خواہ کتنی ہی ترقی کی وہ لیکن اسلامی قوانین اس کی رہنمائی کی اب بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے تمام سوالات کے جوابات دیتے ہیں۔ انسانی زندگی میں پیدا ہونے والے تمام مسائل کا حل ان کے اندر موجود ہے۔ ان میں ایک بالغ اور ترقی یافتہ زمانے اور معاشرے کی تنظیم کی بہترین صلاحیت ہے۔

'بنیادی انسانی حقوق' کا فریب

اس وقت کا سب سے بڑا مسئلہ اور سب سے بڑا بحران یہ ہے کہ مغربی فکر و تعلیم نے اسلام پر سے جدید طبقے کے اعتماد کو متزلزل کر دیا ہے۔ آج کا تعلیم یافتہ انسان کہتا ہے کہ اسلام نے ایک زمانے میں بے شک اچھا کام کیا تھا، اچھا پارٹ ادا کیا تھا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اس وقت زمانہ بہت ہی غیر ترقی یافتہ تھا۔ اب ماڈرن ہو چکا ہے۔ زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ اب اسلام اس زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہ ہے وقت کا اہم مسئلہ۔ اب یہ ثابت کرنا کہ اسلام اس تنزل کے بعد بھی زمانے کو ہلاکت سے بچا سکتا ہے، اسلام اس دور کو راہ پر لگا سکتا ہے، اسلام اس زمانے کو رہنے کا سلیقہ سکھا سکتا ہے، تعلیم یافتہ طبقہ کا اسلام پر اعتماد واپس لانا ہے۔ اسلام کی ابدیت پر، اس کی افادیت پر، اس کی صلاحیت پر یقین بحال کرنا ہے۔ میرا ۲۰ سالہ تجربہ ہے کہ ہم لوگ مکتب و مدرسہ میں ۶، ۷ سالہ بچے کو اسلام پڑھاتے ہیں۔ جب بچہ ۱۳، ۱۴ سال کی عمر میں مکتب سے فارغ ہو کر نکلتا ہے تو یہاں کا میڈیا اس کے ذہن کو اس طرح شکار کرتا ہے اور اس پر قبضہ کرتا ہے کہ چند سال میں جو کچھ اس نے مسجد و مدرسہ میں پڑھا ہوتا ہے، اس کا بڑا حصہ بھول چکا ہوتا ہے اور اس پر یہاں کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ ہماری مثال اس بڑھیا کی سی ہے جو صبح سے شام تک چرخہ کاتتی ہے اور شام کو اسے الٹا گھما کر خود برباد کر دیتی ہے۔ اس طرح ہماری ساری دینی تعلیمی کوششوں پر یہاں کا میڈیا پانی پھیر دیتا ہے۔ ہم بچے کے ذہن و دماغ میں اسلام کی بنیاد تعمیر کرتے ہیں اور میڈیا اسے مسمار کر دیتا ہے۔ مغرب کے میڈیا کا اسلام کے خلاف ایک موثر ہتھیار انسانی حقوق کا مسئلہ ہے جسے مغربی میڈیا نہایت عیاری سے اسلام کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔ نصف صدی پہلے تک جن لوگوں کے نزدیک کروڑوں انسانوں کی حیثیت حیوانوں سے زیادہ نہیں تھی، وہ اچانک انسانی حقوق کے

ٹھیکیدار بن گئے گویا پرانے شکاری نیا جال لے کر آئے ہیں۔ انسانی حقوق کی تعریف کیا ہے؟ اس کی حدود کیا ہیں؟ وہ کہاں پامال ہو رہے ہیں؟ اس کا فیصلہ بھی امریکہ اور مغرب کرے گا تاکہ اس حوالے سے بھی مغرب کو کمزور ممالک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا موقع مل سکے۔ آپ فلسطین سے فلپائن تک، بوسنیا سے کشمیر تک مغرب کے انسانی حقوق کی حقیقت کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ آج کل فلسطین اور برما میں ہزاروں بے قصور انسانوں کو جس بے رحمی سے قتل کیا جا رہا ہے، اس پر مغربی میڈیا کی مجرمانہ خاموشی بہت کچھ بتا رہی ہے۔ مغرب کے انسانی حقوق کی حقیقت سمجھنے کے لیے ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ پاکستان کے ممتاز دانشور جناب ڈاکٹر صفدر محمود نے روزنامہ ''جنگ'' میں اپنا ایک دلچسپ واقعہ لکھا تھا۔ انہیں جون ۱۹۹۱ء میں ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے لیے سان فرانسسکو جانا پڑا۔ اس سیمینار میں ایشیائی ممالک کے اسکالرز کے علاوہ مختلف امریکی یونیورسٹیوں سے بھی ممتاز پروفیسر صاحبان بلائے گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''میں نے سیمینار کے آغاز سے ایک روز پہلے ٹی وی آن کیا تو ایک دلچسپ خبر مع تبصرہ سننے کو ملی۔ کیلیفورنیا کی ریاست میں لکڑی کی کٹائی کا عمل جاری رہتا ہے۔ خبر یہ تھی کہ کٹائی کے دوران ماہرین جنگلات کو اچانک پتہ چلا کہ اس جنگل میں ایک الو نے اپنا ایک مستقل گھر بنا رکھا ہے اور جب سے درختوں کی کٹائی کا سلسلہ شروع ہوا ہے، الو صاحب اداس رہنے لگے ہیں۔ الو کی اداسی کی خبر سے اس علاقے میں احتجاج ہوا اور کیلیفورنیا کی حکومت نے کٹائی روک دی جس سے لکڑی کی قیمت میں اضافہ ہو گیا اور مکانوں کی تعمیر قدرے مہنگی ہو گئی۔'' اگلے سیمینار کے دوران چائے کا وقفہ ہوا تو میں نے ممتاز امریکی پروفیسر صاحبان سے اس خبر کا تذکرہ کیا۔ وہ پہلے ہی اس سے آگاہ تھے۔ ان کے چہرے خوشی سے گلاب کی طرح کھل گئے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے یہ سوال داغ دیا کہ آپ نے ایک پرندے کی اداسی کی خاطر جنگل کی کٹائی روک کر لکڑی کی قیمت میں اضافہ برداشت کر لیا، لیکن چار ماہ قبل عراق کے بے قصور اور معصوم شہریوں پر بموں کی بارش کی جا رہی تھی، اس پر یہاں کوئی احتجاج نہیں ہوا۔ کیا آپ کو ایک جانور ہزاروں مسلمانوں کی زندگی سے زیادہ عزیز ہے؟ وہ لکھتے ہیں ''میرے سوال سے ان کے چہروں کے رنگ اڑ گئے؟'' اس ایک واقعہ سے مغرب کے انسانی حقوق کی حقیقت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

میڈیا کی اہمیت

اس دور کا سب سے بڑا چیلنج میڈیا ہے اور یہ انسانیت کی بدقسمتی ہے کہ میڈیا کا موثر ترین اور طاقتور ہتھیار ان لوگوں کے پاس ہے جن کے پاس نہ انسانیت کے غم میں تڑپنے والا دل ہے، نہ اس کی بدنصیبی پر

آنسو بہانے والی آنکھ اور نہ انسانیت کی بہبودی و تعمیر کا کوئی پروگرام۔ میڈیا کی یہ طاقت تعمیر کے بجائے تخریب کے لیے، کردار و اخلاق سنوارنے کی بجائے بے حیائی اور اخلاقی قدروں کی پامالی کے لیے، انسانوں کی رہنمائی کے بجائے انہیں راہ سے بھٹکانے کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔

اس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لوگ جو خیر امت ہونے کے دعویدار ہیں، جو انسانیت کے سب سے بڑے محسن اور بہی خواہ کی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ دنیا کے سارے انسان اللہ کی فیملی ہے اور خدا کے نزدیک وہ بہتر ہے جو انہیں نفع اور فائدہ پہنچانے والا ہے اور جو انسانیت کی تباہی و بربادی کا غم رکھتے ہیں، آگے بڑھیں۔ ہمارے اسلاف نے دوسری صدی ہجری میں یونانی فکر و فلسفہ کا چیلنج قبول کر کے اسے اسلام کا معاون بنالیا تھا۔ ان کے نقش قدم پر آج کا چیلنج قبول کریں۔ اس میڈیا کو مسلمان بنائیں۔ اس صحافت کو، ریڈیو، ٹی وی اور سیٹلائٹ کو مشرف بہ اسلام کریں۔ انہیں انسانیت کی تعمیر و بھلائی کے لیے استعمال کریں۔ علوم کی اشاعت، اخلاق کی تعلیم، کردار سازی اور بھٹکی ہوئی انسانیت کی رہنمائی کے لیے استعمال کریں۔ الحمد للہ! ہمارے ہاں میڈیا کے مختلف شعبوں کے ماہرین اور ذمہ دار موجود ہیں، وہ اس چیلنج کو قبول کریں۔ یہ کام صرف علما یا کسی خاص طبقہ کا نہیں بلکہ ہر مسلمان کا ہے۔ یہ اس ملت بیضا کی خصوصیت رہی ہے کہ جب بھی اسلام نے پکارا تو مسلمانوں کے تمام طبقات نے دل و جان کی بازی لگا دی۔ مغربی فکر و میڈیا کا جواب بھی اب مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔

ایک بات واضح طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ مغرب کے ۹۵ فیصد عوام کی اسلام سے کوئی لڑائی نہیں۔ یہ غریب خود منزل کی تلاش میں سرگرداں اور ایک مخصوص طبقے کے ستم کا شکار ہیں۔ یہ محبت و شفقت اور رحم کے مستحق ہیں بلکہ درحقیقت ہمارے لیے خام مال یعنی RAW میٹریل ہیں۔ انہی میں سے آج کے عکرمہ بن ابی جہل اور خالد بن ولید پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ہزارہا اسلام کے علمبردار بن سکتے ہیں۔

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

مغربی میڈیا کا متبادل فراہم کرنا مسلم دنیا کی ۵۰ سے زائد حکومتوں کی دینی، قومی اور اخلاقی ذمہ داری تھی مگر یہ حکومتیں اب تک کوئی خبر رساں ایجنسی تک قائم نہ کر سکیں۔ مغرب نے ہر جگہ اپنے آلہ کار مسلط کر رکھے ہیں۔ یوں تو ۲۰ سال سے مسلم ممالک کی تنظیم او آئی سی کے ایجنڈے پر میڈیا سرفہرست ہے اور جدہ میں برسہا برس سے اس کے لیے ایک عالیشان عمارت میں دفتر بھی قائم ہے مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ اس کا مقصد عالم اسلام کے لیے خبر رساں ایجنسی و سٹیلائٹ کا قیام نہیں بلکہ مسلم دنیا میں اگر کوئی کام ہو رہا ہو تو اسے روکنا ہے۔ مسلم دنیا کے حکمران ہی نہیں، ان کے زیر اثر دینی تنظیموں تک کے لیے اسلام

سے زیادہ مغرب کا وفادار و بہی خواہ ہونا ضروری ہے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی قابل ہو، جب تک ''پرو امریکی'' نہ ہو، وہ رابطہ عالم اسلامی کا ممبر بن نہیں سکتا۔ اگر وہ دل سے اسلام اور مسلمانوں کا درد رکھتا ہے تو ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کی طرح علیحدہ کر دیا جائے گا۔

عظمتِ رفتہ کی بازیافت

یہ ضروری ہے کہ ہماری نئی نسل اپنے بزرگوں کے عظیم الشان کارناموں سے آگاہ ہو تاکہ اس کا احساس کمتری ختم ہو اور وہ ایک بار پھر سابقہ عظمت حاصل کرنے کا سوچے اور اس کے لیے اپنے بزرگوں کی طرح بھرپور کوشش کرے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو ان شاءاللہ ہم ایک بار پھر عظیم قوم بن جائیں گے۔ نفسیات کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اگر آپ ایک کام پہلے کر چکے ہوں تو آپ اسے دوبارہ بھی کر سکتے ہیں۔ تیرہویں صدی عیسوی میں منگولوں نے ہمیں تاراج کیا مگر ہم کپڑے جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک بار پھر عظیم قوم بن گئے۔ اب پھر ایسا ہوسکتا ہے کیونکہ ہم پہلے ایسا کر چکے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم پہلے کی طرح دل و جان سے اپنے نظریۂ حیات سے وابستہ ہو جائیں اور ہر شعبۂ زندگی، خصوصاً اخلاقیات میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکمل اطاعت کریں تو عظمت ایک بار پھر ہمارے قدم چومے گی، ان شاءاللہ۔ (پروفیسر ارشد جاوید)

میڈیا

الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا کی اصلاح کے لیے عملی اقدامات کیجیے

پیمرا اور پریس کونسل آف پاکستان سے شکایت کا طریق کار

پیمرا

الیکٹرانک میڈیا کی غیر اسلامی سرگرمیوں کے خلاف حکومتی نگران ادارے پیمرا سے مندرجہ ذیل پتے پر بذریعہ خط، فیکس، فون (ٹول فری ۲۴ گھنٹے) یا ای میل شکایت کی جاسکتی ہیں:

PEMRA Headquarters, Mauve Area G-8/1, Islamabad
Call Center (Tel):0800-73672 Email:complaints@pemra.gov.pk,
Fax:92-51-9107147

پریس کونسل آف پاکستان

پریس کونسل آف پاکستان ایک خودمختار ادارہ ہے جس کا کام پاکستانی روزنامہ و ماہنامہ اخبارات، رسائل و جرائد، نیوز ایجنسیوں اور ان کی ویب سائٹ پر نظر رکھتے ہوئے میڈیا کے اعلیٰ معیار کا اجراء کرنا ہے۔ کونسل کے مقاصد یہ ہیں: ۱۔ کسی بھی ایسی سرگرمی پر نظر رکھنا جو عوامی دلچسپی اور اہمیت کی حامل خبروں کے پھیلاؤں پر حد مقرر کرتی ہو۔ ۲۔ پرنٹ میڈیا سے متعلق اخلاقی ضابطہ کی خلاف ورزی پر شہریوں سے شکایات وصول کرنا اور اس پر فیصلہ دینا ہے۔ ۳۔ اخلاقی ضابطہ کے مطابق یاددہانی کروانا، اس میں اضافہ کرنا اور عمل درآمد کرانا۔ کونسل پریس کی آزادی اور وفاقی حکومت، صوبائی حکومت یا کسی بھی آرگنائزیشن بشمول سیاسی جماعتوں کی اخبارات کے خلاف پریس کے آزادانہ طریق عمل میں مداخلت میں ایک شیلڈ کا کردار ادا کرتی ہے۔ ۴۔ کونسل اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے اعلیٰ اخلاقی اقدار پر عمل درآمد یقینی بنائے گی تاکہ آزادیٔ صحافت کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو۔

کونسل کی تشکیل

کونسل انیس ارکان بشمول چیئرمین پر مشتمل ہے CPNE,APNA اور PFUJ سے چار چار ارکان، پاکستان بار کونسل سے وائس چیئرمین، ہائر ایجوکیشن کمیشن سے چیئرپرسن یا نامزد، نیشنل اسمبلی میں لیڈر آف ہاؤس کا ایک رکن، نیشنل اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر کی طرف سے نامزد کردہ ایک رکن، کونسل کا نامزد کیا ہوا تعلیم ابلاغیات کا ایک ماہر، خواتین کے نیشنل کمیشن کی جانب سے نامزد کردہ ایک خاتون رکن۔

انکوائری کمیشن

انکوائری کمیشن درخواستوں کے فیصلے لیے ضرورت کے تحت جتنے انکوائری کمیشن چاہے تشکیل دے سکتا ہے جو تین ارکان پر مشتمل ہوں گے جن میں ایک ریٹائرڈ ہائی کورٹ جج اور CPNE اور APNS سے نامزد ایک ایک رکن ہوتا ہے۔

شکایت درج کرانے کا طریق کار

۱۔ درخواست دہندہ کا پریس کونسل میں شکایت درج کرانے سے پہلے متعلق ایڈیٹر/پبلشر کو نوٹس بھجوانا ضروری ہے۔

۲۔ ہر وہ درخوست جو کونسل کو جمع کروائی جائے گی مبصر حقائق پر مشتمل ہوگی جس پر درخواست دہندہ کی درخواست کا انحصار ہوگا۔

۳۔ کسی بھی کیس میں اگر درخواست دہندہ کسی غلط بیانی، بلیک میلنگ اور دھوکہ دہی کی نشاندہی

کررہا ہو، درخواست میں واضح طور پر درج کرے گا۔

۴۔　کمیشن کیس کے مطابق دی گئی درخواست کو تیس دن کے اندر حل کرے گا۔ اگر کمیشن کے فیصلے کے خلاف کونسل کو اپیل کی گئی ہو تو کونسل اس کو ساٹھ دنوں میں حل کرے گی۔

فیصلہ پر مناسب عملدرآمد نہ ہونے کی صورت میں کونسل تادیبی کارروائی عمل میں لاتے ہوئے متعلقہ فرد کو فوری معذرت کی اشاعت، وارننگ جاری کرنے، تنبیہ یا سرزنش کرنے، باقی اخبارات میں کونسل کا فیصلہ شائع کرنے یا متعلق اخبار کی اشاعت کو مخصوص مدت کے لیے بند کرنے یا ڈیکلیریشن کو منسوخ کرنے کا نوٹس جاری کرسکتی ہے۔

عیدمبارک

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

استفسارات　　　ڈاکٹر محمد امین

انقلاب بذریعہ سماجی تبدیلی
مجوزہ تحریک اصلاح وخدمت پر چند اعتراضات

جولائی کے شمارے میں مجوزہ تحریک اصلاح وخدمت کے حوالے سے جہاں حوصلہ افزائی اور حمایت کے فون ملے وہیں بعض لوگوں نے اعتراضات وشبہات کا بھی ذکر کیا جن میں سے دو کا یہاں جواب دیا جارہا ہے۔　مدیر

سوال: لگتا ہے دوسرے لیڈروں کی دیکھا دیکھی آپ بھی اپنی اڑھائی اینٹ کی الگ مسجد بنانے پر تل گئے ہیں خواہ اس میں چند ہی نمازی ہوں۔

جواب: حاشا وکلا! ایسی ہرگز کوئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نفس اور شیطان کے شر سے محفوظ رکھے (آمین)۔

بات صرف اتنی ہے کہ ہم پورے اخلاص اور دردمندی کے ساتھ پاکستانی معاشرے کے اسلامی مستقبل کے حوالے سے پریشان رہتے ہیں اور حسبِ استطاعت اس پر غور و فکر کرتے ہوئے بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہماری سیاسی قیادت کا رویہ تباہ کن ہے اور وہ اپنے اقتدار کے تحفظ و استحکام کے لیے مغربی قوتوں کی خواہشوں اور سازشوں میں ان کی آلہ کار بنی ہوئی ہے۔ دینی قیادت، خواہ وہ سیاسی میدان میں متحرک ہو یا روایتی تدریسی و دعوتی سرگرمیوں میں مشغول، متعدد وجوہ سے غیر موثر ہو چکی ہے جس کے نتیجے میں اسلامی اصول و اقدار پسپا ہو رہی ہیں (بلکہ ہو چکی ہیں) اور مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کے اصول و اقدار معاشرے میں غالب آ چکی ہیں اور سکہ رائج الوقت بن چکی ہیں۔

ان حالات میں پاکستانی معاشرے کے اسلامی مستقبل کے تحفظ کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جائے اور اس کے لیے کیا لائحہ عمل اپنایا جائے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر برسوں غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کا حل قوم کو، خصوصاً اس کے پڑھے لکھے متدین حضرات کو، غیر سیاسی، سماجی تبدیلی کے لیے متحرک کرنا ہے تاکہ ایک ایسی تحریک وجود میں آ سکے جو ایک طرف ان اداروں کی اصلاح کرے جو فرد کی ذہن سازی اور تعمیر شخصیت کا کام کرتے ہیں (یعنی تعلیم و تربیت، میڈیا اور اخلاقی اصولوں پر عمل) اور دوسرے معاشرے کے دبے اور پسے ہوئے مجبور و مقہور طبقوں کی مدد کرے تاکہ غریب دو وقت کی روٹی سے محروم نہ رہیں، مظلوموں کو انصاف مل سکے اور عام آدمی امن و سکون کی زندگی گزار سکے۔

ہم اس تحریک کی محض فکر دینے والے ہیں اگر اللہ کو منظور ہوا اور یہ فکر معاشرے میں عام ہوگئی تو اس کی قیادت بھی فطری انداز میں اس کے اندر سے ابھرے گی۔ ہمیں خواہش اقتدار اور آرزوئے لیڈری کے طعنے دینا موزوں نہیں۔ اس تحریک کی خاص بات یہ ہے کہ یہ پہلے ہونے والے دینی کاموں کی تخریب و تنقیص کی قائل نہیں بلکہ سول سوسائٹی کے ان لوگوں کو متحرک کرنا چاہتی ہے جو اس وقت غیر متحرک اور غیر منظم ہیں لہٰذا موجود دینی سرگرمیوں میں مشغول لوگوں کو اس تحریک کو نہ تو اپنا مدمقابل سمجھنا چاہیے اور نہ اپنا مخالف۔

سوال: آپ نے مجوزہ تحریک کے لیے سول سوسائٹی کو فوکس کرنے کی بات کس حوالے سے کی ہے؟

جواب: اس کی متعدد وجوہ ہیں:

۱۔ کسی خاص مقصد کے لیے سوسائٹی کے کسی خاص عنصر کو مخاطب کرنا یا سوسائٹی کے کسی خاص

عنصر کو متحرک کرنے کی کوشش کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ سوسائٹی کے دوسرے عناصر کی نفی یا حوصلہ شکنی مطلوب ہے مثلاً پاکستان کے موجودہ سیاسی حالات کو دیکھیے کہ تحریک انصاف نے نوجوانوں کو ہدف بنایا ہوا ہے اور وہ نوجوانوں کو اپنے حق میں متحرک کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ تحریک انصاف میں ادھیڑ عمر لوگوں اور بزرگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے نہ جاوید ہاشمی 'نوجوان' ہیں نہ شاہ محمود قریشی اور نہ خود عمران خان، اور دیگر سیاسی جماعتوں میں بھی یوتھ ونگ پہلے سے موجود ہیں تاہم اس کے باوجود تحریک انصاف کے خصائص میں سے ایک امر یہ ہے کہ اس نے نواجونوں کے ذریعے تبدیلی کی بات کی ہے بلکہ اس کے لیے اس نے مربوط کوششیں کی ہیں اور کر رہی ہے۔

اسی طرح ہم مجوزہ تحریک کے لیے سول سوسائٹی کے دیندار افراد کو فوکس کرنا چاہتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم مجوزہ تحریک میں سیاستدانوں یا علماء کرام کی حوصلہ شکنی کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ہم سول سوسائٹی کے پروفیشنلز کو اس تحریک کے لیے زیادہ مفید اور موثر سمجھ کر انہیں ٹارگٹ کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ پاکستان میں سیاسی اور دینی قیادت بطور چینج ایجنٹ ناکام ہو چکی ہے۔ ہماری سیاسی قیادت مغرب کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے اور اپنی خودی کھو چکی ہے۔ یہ ایک ایسی نمایاں حقیقت ہے کہ اس کے لیے دلائل و براہین کی ضرورت نہیں۔ دینی قیادت بھی یہ حیثیت وصلاحیت کھو چکی ہے اور یہ تجزیہ نیا نہیں کافی پرانا ہے اور صرف ہمارا نہیں بلکہ ہم سے بڑے اور بہت سینئر علماء کا ہے۔ دیوبند کے سربراہ اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ جب مالٹا سے رہا ہو کر آئے تو انہوں نے ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تاسیسی اجلاس میں کہا تھا کہ 'جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا...... میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت ونقاہت کی حالت میں (جس کو آپ خود مشاہدہ فرما رہے ہیں) آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں...... مجھے لیڈروں سے زیادہ ان نونہالان وطن کی ہمت بلند پر آفرین اور شاباش کہنا چاہیے جنہوں نے اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لیے اپنی ہزاروں امیدوں پر پانی پھیر دیا'۔

اور امیر شریعت، قائد احرار اور برصغیر کے مقرر بے بدل حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے (غالباً ۱۹۴۶ء میں) لاہور کے جلسۂ عام میں سرعام یہ بات کہی تھی کہ لاہور یو! ساری رات تقریر میری سنتے ہو اور کہتے ہو 'واہ! شاہ جی واہ!' لیکن صبح ووٹ جا کر مسلم لیگ کے ڈبے میں ڈالتے ہو۔

اور پرانی باتوں کو چھوڑیے تازہ تجربہ جماعت اسلامی کا ہے کہ دین کے نام پر اس کی ۴۷ سالہ جدوجہد کی انتخابی کامیابیوں کا حاصل کیا ہے؟ اور مدرسوں اور مسجدوں کے ذریعے روایتی علماء جو کام کر رہے ہیں وہ معاشرے میں جتنی تبدیلی لا سکے ہیں اس کام آل کیا ہے؟

دیکھیے! ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ ان لوگوں کی جدوجہد رائیگاں گئی اور بالکل بے نتیجہ رہی......نہیں! ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ان لوگوں کی جدوجہد کے باوجود کفر کا غلبہ اور اثرات معاشرے پر بڑھ رہے ہیں لہٰذا بہتری کی گنجائش موجود ہے، نئے زورشور سے کام کی ضرورت ہے اور پرانے منہج اگر زیادہ مفید نہیں رہے تو نیا منہج اپنانے میں کیا ہرج ہے؟ بلکہ نئے منہج کا نہ سوچنا (اور نہ سوچ سکنا) عیب اور دقیانوسیت کی بات ہے......لہٰذا 'انقلاب بذریعہ سماجی تبدیلی کی ہماری تجویز سنجیدہ غور وفکر کی مستحق ہے اور جو فہیم اور نیک روحیں اس کی ضرورت، افادیت اور اہمیت کو سمجھیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس منہج پر کام کرنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوں کہ اس میں مسلم فرد اور امت کا بھلا ہے۔

۳- ہماری یہ تحریریں چونکہ ماہانہ جرائد میں وقفے وقفے سے شائع ہو رہی ہیں لہٰذا ان میں بظاہر کوئی ربط محسوس نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم پچھلے تین چار سال سے ایک خاص ترتیب اور نہج سے اس موضوع پر لکھ رہے ہیں اور ہم نے پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں، مدارس ومساجد میں مصروف کار علماء کرام، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت......وغیرہ سے اس موضوع پر ڈائیلاگ کیا ہے۔ ان کے اعتراضات سنے ہیں اور اپنی معروضات کئی ڈھنگ سے ان کے سامنے رکھی ہیں اور اس ضمن میں سول سوسائٹی کے دیندار افراد کو بھی مخاطب کیا ہے۔ جب یہ تحریریں یکجا شائع ہوں گی تو ان میں ایک تسلسل، حکمت اور ربط نظر آئے گا، ان شاء اللہ۔

تبصرۂ کتب　　　　قیوم نظامی

امریکی زوال پر تھامس فریڈ مین اور مینڈل بام کی کتاب

"That used to be us"

By Thoomas L. Friedman & Michael Mandelbaum

تھامس فریڈ مین امریکہ کا معروف صحافی اور مینڈل بام نامور تعلیمی ماہر ہے۔ دونوں نے ایک تحقیقی کتاب "That used to be us" (ہم جو کبھی تھے) کے نام سے تحریر کی ہے۔ اس کتاب کا مرکزی خیال یہ ہے کہ امریکہ دنیا میں پیچھے کیسے رہ گیا ہے اور کھویا ہوا مقام کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ امریکی مصنفین امریکہ کو درپیش خطرات سے آگاہ کرتے اور ان کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔ دونوں مصنفین کا

خیال ہے کہ امریکی عوام دنیا کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے ہیں، امریکی سیاسی نظام مفلوج ہو چکا ہے اور ادارے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے۔ امریکہ کا سیاسی نظام بڑے مسائل کا ٹھوس حل پیش نہیں کرتا اور یوں امریکی معاشرہ زوال پذیر ہے۔ ان کے الفاظ میں

"Our Country is in a slow decline, just slow enough for us to be able to pretend or belive that a decline is not taking place"

’’ہمارا ملک سست روی سے زوال پذیر ہے۔ اس کا انحطاط اس قدر سست ہے کہ ہم فریب میں مبتلا ہو کر یقین کر سکتے ہیں کہ امریکہ کی زوال پذیری واقع نہیں ہو رہی۔‘‘

امریکی مصنفین کے مطابق کثیر بجٹ خسارہ، سیاسی بحران، معاشی انحطاط اور غیر معیاری تعلیم زوال کا سبب ہیں۔ فریڈ مین اور مینڈل بام کہتے ہیں کہ امریکہ دنیا کے کئی ترقی کرنے والے ممالک سے پیچھے رہ گیا ہے اور اس کا مقدر ہی یہ ہے کہ ۲۱ ویں صدی میں مزید پیچھے چلا جائے۔ مصنفین نے امریکی پالیسی کی چار غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو سست زوال کا سبب بنی ہیں (۱) امریکہ نے سرد جنگ کے خاتمے کو درست طور پر نہ سمجھا جس کے نتیجے میں نئے چیلنج پیدا ہوئے اور گلوبلائزیشن وجود میں آئی۔ (۲) امریکہ نے ٹیکنالوجی میں تیز رفتار تبدیلیوں کا درست اندازہ نہ لگایا، جن سے دنیا کے مختلف ملکوں کے درمیان حائل رکاوٹیں ختم ہو گئیں (۳) ۹/۱۱ کے بعد غلط راستے کا انتخاب کرنا (۴) عظیم اوّلین امریکی نسل کی اخلاقی اقدار سے لاتعلقی۔

مصنفین کے خیال میں امریکہ کا تعلیمی نظام انحطاط پذیر ہے۔ ۳۰ سال قبل کیلیفورنیا کی دس فیصد آمدنی اعلیٰ تعلیم کے لیے مختص کی جاتی تھی اور ۳ فیصد جیلوں پر خرچ کیا جاتا تھا۔ آج ۱۱ فی صد جیلوں پر اور ۸ فیصد اعلیٰ تعلیم پر خرچ ہوتا ہے۔ مصنفین کو تشویش ہے کہ ایک فیصد امیر ترین امریکی ہر سال امریکہ کی کل آمدنی کا ۲۵ فیصد ہڑپ کر جاتے ہیں۔ امیروں کو اجتماعی ترقی کی ضرورت نہیں رہی کہ انہوں نے اپنی دنیا الگ بسا رکھی ہے۔ ان کے اپنے کنٹری کلب ہیں، اپنے سکول اور ہسپتال ہیں۔ ان کو پبلک سکولز کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ان کا اپنا ٹرانسپورٹ سسٹم ہے۔ ان کو پرائیویٹ سکورٹی کی سہولت حاصل ہے۔ امریکہ کے امیروں کو کوئی فکر نہیں ہے اگر پبلک سکولوں کا تعلیمی معیار گر رہا ہے اور پبلک ٹرانسپورٹ سسٹم تسلی بخش نہیں۔ امریکی انتظامیہ نے گلوبل وارمنگ پر پوری توجہ نہیں دی اور نہ اس نے انرجی ٹیکنالوجی کو اپنی ترجیح بنایا ہے حالانکہ انرجی کی قیمتوں میں اضافہ بھی ہو رہا ہے اور ماحولیات کا مسئلہ بھی سنگین ہوتا جا رہا ہے۔

امریکی مصنفین کے خیال میں معاشی اداروں کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اجارہ داری کے بجائے شراکت داری کے اصول پر عمل کیا جائے۔ افراد پر سرمایہ کاری کر کے ان کی مہارتوں میں اضافہ کیا

جائے۔ ملک تعلیم اورورک فورس کی اہلیت اورمہارت میں اضافے سے ترقی کرتے ہیں۔ مصنفین نے امریکہ کی دوبڑی سیاسی جماعتوں ڈیموکریٹ اورری پبلکن کی پالیسیوں کوتنقید کا نشانہ بنایا ہے اور کہا ہے خسارے کوکم کرنے اورٹیکسوں میں اضافے کے بغیر معیشت مستحکم نہیں ہوسکے گی۔ امریکہ کوتاریخ سے سبق سیکھنا چاہیے۔ مصنفین نے ''کامیابی کے پانچ ستونوں'' کی نشاندہی کی جن کی بنیاد پر امریکہ دنیا کی عظیم قوم بننے میں کامیاب ہوا: (۱) امریکہ نے شہریوں کوسائنس اورٹیکنالوجی کی تعلیم فراہم کی (۲) امریکہ نے بہترین انفراسٹرکچر فراہم کیا (۳) ایسے قواعد وضوابط بنائے جن سے سرمایہ کے ذخائر جمع ہوئے اورسوسائٹی کولوٹ مار کے عوامل سے بچایا (۴) امریکہ انتظامیہ نے ریسرچ کی سرپرستی کی جس کے نتیجے میں ٹیکنالوجی کی نئی نئی ایجادات ہوئیں۔ (۵) امریکہ نے بایوٹیکنالوجی پر پوری توجہ دی۔ مصنفین کے مطابق امریکہ کے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ ان چار چیلنجوں کا مقابلہ کیسے کرتا ہے: (۱) گلوبلائزیشن (۲) انفارمیشن ٹیکنالوجی میں انقلاب (۳) بجٹ خسارہ (۴) انرجی کے استعمال کا بہتر انداز۔ امریکہ کومعاشی، سیاسی، سماجی، تعلیمی اورفنی بحرانوں کا سامنا ہے، جن سے باہر نکلنا ناممکن نہیں تومشکل ضرور ہے۔

امریکی تھنک ٹینک اوردانشور امریکی انتظامیہ کو جگانے کی کوشش کرتے رہے ہیں مگر انتظامیہ ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں۔ دنیا پر حکمرانی قائم رکھنے کا جنون امریکہ کولے ڈوبے گا اوراس کا انجام بھی روس کی طرح کا ہوگا۔ پاکستان کے مقتدر طبقے بھی امریکی مصنفین کے تجزیے سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ پاکستان حالات کا بے لاگ تجزیہ کرکے مستقبل کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی کرے۔ جناب میاں نواز شریف اورجناب عمران خان اگر اپنی سیاسی جماعتوں سے اوپر اُٹھ کر سوچیں تو وہ ۱۸ کروڑ عوام کوایسا قومی ایجنڈا دے سکتے ہیں جو پاکستان کے لیے نسخہ کیمیا ثابت ہو (بشکریہ نوائے وقت)۔

تبصرۂ کتب ڈاکٹر ملیحہ لودھی

'اوباما کی خفیہ جنگیں' از ڈیوڈ سانگر

"Confront and Conceal: Obama`s Secret Wars and Surprising use of Amercan Power"

By David E. Sanger

امریکا میں انتخابات کے سال میں شائع ہونے والی ایسی کتابوں کا، جن میں سرکاری راز فاش کیے جاتے ہیں، اکثر مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسی بات چیت کا ڈول ڈالا جائے جو موجودہ صدر کا رخ متعین کرنے میں مدد

کرے۔تاہم اس چکر میں کچھ ایسے انکشافات بھی سامنے آجاتے ہیں جو بصورت دیگر کبھی منظر پر عام نہ آتے۔

اسی ڈھنگ کی ایک کتاب ڈیوڈ سانگر کی ''پنجہ آزمائی کرنا اور چھپانا: اوباما کی خفیہ جنگیں اور امریکی طاقت کا حیرت انگیز استعمال'' ہے جو بتاتی ہے کہ اوباما نے کیسے ڈرامائی انداز میں امریکی ڈرون حملوں کو مہمیز دی اور ایران کے خلاف خفیہ سائبر اقدامات میں شدت پیدا کی۔اگرچہ ان کی ابتداء اوباما نے نہیں کی تاہم ان خفیہ حملوں کی منصوبہ بندی اور ترتیب میں ذاتی طور پر شامل ہوکر اوران پر عمل درآمد کرا کے وہ اُس سے کہیں آگے نکل چکے جس کی ابتداء بش دور میں ہوئی تھی۔ یہ کتاب اوباما کو ایک ایسے کردار کی صورت میں پیش کرتی ہے جس نے اپنی سخت اور پوشیدہ طاقت کو بے لاگ انداز میں استعمال کر کے قومی سلامتی کی پہچان کو مضبوط بنایا، ایک ایسی دنیا میں جہاں کسی ملک پر قابض ہونا سیاسی اور معاشی طور پر انتہائی مشکل ہے۔ ریموٹ کنٹرول ٹیکنالوجی استعمال کر کے خفیہ طور پر نان سٹاپ جنگیں لڑنے کے انتخاب پر سانگر اوباما کی جارحیت پر حیرت کا شکار ہیں کیونکہ اوباما کے ماضی میں اس رویہ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔تاہم اوباما کے اس رویے کے قانونی، اخلاقی اور دوررس اثرات کا تفصیلی جائزہ کتاب میں موجود نہیں۔سانگر اس امریکی پالیسی کے پہلوؤں پر شکوک کا شکار ہیں اور کتاب میں ''ہلکے قدموں کے نشان کا تاریک پہلو'' کی حکمت عملی پر ایک باب بھی باندھا ہے۔تاہم وہ اوباما ڈاکٹرائن میں پھلنے پھولنے والی ان کی یک طرفہ طاقتور محاذ آرائی اور اس کے خفیہ کردار پر تنقید نہیں کرتے، البتہ وہ حکومت پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ اس طرز عمل کو کھلے عام بیان نہیں کرتی لیکن انحصار اسی پر کر رہی ہے۔

اس کے ساتھ کتاب کچھ درست سوالات بھی اٹھاتی ہے مثلاً افغانستان کی دس سالہ جنگ کیوں شروع کی گئی، جس نے صرف شکست خوردگی دی؟ تاہم مصنف کی جانب سے صرف چند سوالات کے جوابات ہی دیے گئے ہیں۔ایک جانب تو وہ امریکی اقدامات کے بالکل ٹھیک ٹھیک نتائج بیان کرتے ہیں مثلاً ایبٹ آباد کا خفیہ آپریشن، ایک ایسا لمحہ تھا جس میں امریکا نے پاکستان کو کھو دیا۔تاہم وہ اس کے دوررس اثرات کا مکمل تجزیہ نہیں کرتے۔ وہ پاکستان بالخصوص پاکستانی فوج کو ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں، تاہم دوسری جگہ خود اپنی بات کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بمشکل ناقابل اعتبار ہے کیونکہ امریکا کے پاس پاکستان کے جوہری ہتھیار تلف کرنے یا ان پر قبضہ کرنے کے لیے ایک بہترین آزمودہ تفصیلی منصوبہ موجود ہے، جسے اوباما نے مزید بہتر اور جھول سے پاک بنا دیا ہے۔اور مزے کی بات یہ کہ ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان کے جوہری ہتھیاروں کا صفایا کرنے کا کوئی منصوبہ موجود نہیں کیونکہ اب تک ان کا محل وقوع ہی معلوم نہیں ہوسکا۔'بم کا خوف' والے باب میں وہ بیان کرتے ہیں کہ اوباما کی صدارت کے اوائل میں مبہم امریکی انٹیلی جنس نے دعویٰ کیا کہ پاکستانی طالبان کے بعض عناصر نے ایٹمی ہتھیاروں تک رسائی حاصل کر لی ہے یا پھر اس سے کچھ کم خطرناک مگر انتہائی شدت کے حامل ڈرٹی بم

تک تو پہنچ ہی گئے ہیں۔اس دعویٰ کے بعد اوباما انتظامیہ میں کھلبلی مچ گئی اور اس نے خطے میں ایک خفیہ مشن اور ایجنٹس بھیج دیے تاہم بحران ٹل گیا جب یہ پتہ چلا کہ خبر جھوٹی تھی اور نیشنل سیکورٹی ایجنسی نے بیت اللہ محسود اور ان کے ساتھیوں کے درمیان ہونے والی بات چیت کا غلط مطلب لیا تھا۔

اور ایسا پہلی بار نہ ہوا تھا کہ امریکی انٹیلی جنس مکمل طور پر ناکام ہوگئی تھی۔آخر عراق میں بھی تو بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا دعویٰ جھوٹا ثابت ہوا تھا۔سانگر کے مطابق بجائے اس کے کہ امریکا ان جھٹکوں سے سنبھلتا، اس واقعے نے حکومت پر ایک پائیدار نقش ثبت کر دیا۔امریکا نے ۲۰۱۴ء کے بعد بھی افغانستان میں اپنی محدود موجودگی برقرار رکھنے کا پکا منصوبہ بنا لیا اور ایسا صرف انسداد دہشت گردی کے آپریشن کرنے کے لیے نہیں بلکہ بوقت ضرورت پاکستان پر حملہ کرنے کے لیے بھی کیا گیا۔

اگرچہ پاکستانی قارئین کی زیادہ تر دلچسپی اپنے ملک کے بارے میں کسی انکشاف کے بارے میں ہی ہوگی تاہم کتاب نے کئی وجوہات کی بناء پر توجہ حاصل کی۔ایران کے جوہری پلانٹ کو تباہ کرنے کے لیے امریکی اسرائیلی سائبر منصوبہ کی تفصیلات بھی انہی وجوہات میں سے ایک ہے۔اسٹکس نیٹ چکر کہلائے جانے والے اس منصوبے کی خبریں کافی عرصے تک گردش کرتی رہیں، جن کی آج تک کبھی اس کی تصدیق نہیں ہوسکی۔سانگر کی کتاب اور نیویارک ٹائمز میں شائع ہونے والے ایک مضمون نے پہلی بار امریکی حکام کا حوالہ دیا جس میں انہوں نے تصدیق کی کہ امریکا اور اسرائیل نے گٹھ جوڑ کر کے ایران کے خلاف سائبر جنگ چھیڑ رکھی ہے۔''خفیہ جنگ'' کے باب میں سانگر نے تفصیل سے روشنی ڈالی کہ ایران کے یورینیم افزودہ کرنے کے مقامات کو تباہ کرنے کا ایک خفیہ منصوبہ کیسے بری طرح ناکام ہوا۔صرف ایک بے احتیاطی کے باعث انٹرنیٹ پر کمپیوٹر وائرس چھوٹ گیا تھا۔پھر کیا تھا ہیکرز نے دیکھتے ہی دیکھتے اس جیسے ڈھیروں وائرس بنا ڈالے جنہیں اسٹکس نیٹ کا نام دیا گیا۔تاہم اس طرح کا عیاں دباؤ بھی ''اولمپکس گیمز'' (آپریشن کا خفیہ نام) کو شروع ہونے سے نہ روک سکا۔

سانگر دعوی کرتے ہیں کہ ایران کے خلاف امریکی سائبر جنگ کا بڑا مقصد ایران کو ایٹم بم بنانے سے باز رکھنا تھا، جس کا مقصد اسرائیل کو فضائی حملوں سے باز رکھنا اور ایک نئی جنگ چھڑ جانے کا خدشہ ختم کرنا تھا۔سائبر جنگ کے ایک نئے دور میں امریکا کی قیادت کرتے ہوئے اوباما اور ان کی ٹیم اس معاملے کے منفی پہلوؤں سے لاپرواہ دکھائی دیتی ہے۔افشا ہوجانے والے اس تنازعہ کے بعد امریکا میں زیادہ تر بحث اس پر ہوئی کہ آخر کیوں بے جا حمایت کے حصول کے لیے حساس معلومات افشا کی گئیں، بجائے اس کے کہ اس پر بحث کی جاتی کہ سائبر جنگ مسلط کرنے کے کتنے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔فائنانشیل ٹائمز اپنے ایک حالیہ اداریے میں رقم طراز ہے کہ اسٹکس نیٹ کی کہانی ایک ایسی قوم کی منفرد مثال بیان

کرتی ہے جو اپنے سائبر جنگی جنون کے آپریشنوں پر شیخیاں بگھار رہی ہے۔ کالم میں سائبر ایکٹویٹی کو عالمی سلامتی کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیتے ہوئے عالمی سائبر قوانین بنانے کا بھی مطالبہ کیا گیا ہے۔ اُس نئی اسلحے کی دوڑ کو روکنے کے لیے جو قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ سانگر کی کتاب اوباما کی افغان پالیسی میں تبدیلیوں کے بارے میں کوئی نئے انکشافات نہیں کرتی۔ اوباما کی صدارت کے اوائل میں ہونے والی فاش غلطیوں کے بارے میں زیادہ تر چیزوں کا سب کو پہلے سے ہی علم ہے یعنی جلدی جلدی میں ہونے والا ابتدائی افغان جائزہ کا طریق کار، دھاندلی کا شکار ۲۰۰۹ء کے افغان صدارتی انتخابات، نوکر شاہی کی چپقلشیں اور ان کی قومی سلامتی کی ٹیم میں اختلافات وغیرہ۔

سانگر کی کتاب میں انہی باتوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو اس سے قبل باب وڈ ورڈ اور دیگر لوگ بیان کر چکے ہیں۔ اوباما کا دل کبھی جنگ کی طرف مائل نہ تھا۔ اپنی صدارت کے صرف دو سال میں ہی انہیں یہ بات سمجھ آ گئی کہ وہ افغانستان کی دوبارہ تعمیر نہیں کر سکتے۔ ۸ سالہ جنگ کے بعد بھی کوئی حکمت عملی موجود نہیں اور بڑھتے ہوئے اخراجات پر وہ گہری تشویش کا شکار ہیں۔ ۲۰۱۰ء کے اواخر میں اوباما نے راستہ تلاش کرنا شروع کر دیا تا کہ افغانستان سے واپس بھاگا جائے۔ امریکا کے افغان اہداف میں کمی کی جائے اور طالبان یا حقانی نیٹ ورک کو عسکری طور پر شکست دینے کی بجائے توپوں کا رخ القاعدہ کی طرف کر کے اسے بدنام کیا جائے۔ دریں اثناء ان کی قومی سلامتی کی ٹیم کو ملا عمر والے طالبان کو سہولیات فراہم کرنے کی ہدایت کی گئی۔ یہ جنگ اب ''ضروری جنگ'' سے ''افغانی ہی کافی ہیں'' کے تصور میں تبدیل ہو چکی ہے۔ پہلے اوباما ضروری جنگ کے آئینے سے افغانستان کو دیکھتے تھے لیکن وہ آئینہ اب دھندلا چکا ہے اور ''افغانی خود ہی سنبھالیں'' میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ایک ایسا تصور جس سے مزید معمولی مقاصد اور وسیع پیمانے پر انسداد عسکریت پسندی سے کنارہ کشی کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک انکشافات سے بھرپور حصے میں سانگر نے ہالبروک کے مرنے سے پہلے ان کے ساتھ ہونے والی اپنی آخری بات چیت بیان کی ہے۔ ہالبروک نے سوال اٹھایا کہ آیا واقعی اوباما ایک امن معاہدے پر یقین رکھتے ہیں اور اس کی خواہش اور مستقل مزاجی رکھتے ہیں یا پھر صرف افغانستان سے دفع ہو جانا چاہتے ہیں۔

اس سے سانگر نے نتیجہ اخذ کیا کہ صرف ایک بات یقینی ہے کہ امریکہ افغانستان سے بھاگے گا اور اونچی دیواروں کے پیچھے بند ایک چھوٹی سی فوجی قوت چھوڑ دی جائے گی کیونکہ شائد القاعدہ زیادہ تر بکھر چکی ہے تاہم افغانستان کی از سر نو تعمیر کا ایک گرانڈیل منصوبہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ پاکستانی قارئین کی زیادہ تر دلچسپی کا مرکز ۲ مئی ۲۰۱۱ء کے ایبٹ آباد آپریشن کی منصوبہ بندی اور طریق کار کو بیان کرنے والا باب ہوگا تاہم اس میں بھی ایسی کوئی خاص بات موجود نہیں جو پہلے سے پتہ نہ ہو۔ سانگر انہی باتوں کو بیان

کرتے ہیں جو اس سے قبل امریکی حکام کی جانب سے افشا کی گئیں یعنی کیسے اسامہ کے پیغام رسانوں کی نشاندہی ہونے سے اسامہ کا پتہ چلا اور امریکی حکومت میں شدید اندرونی بحث کہ آیا واشنگٹن بمباری کرے یا پھر خفیہ ہیلی کاپٹرز آپریشن کرنے کا خطرہ مول لے جیسا کہ کیا گیا۔ انہوں نے کئی بار بیان کی جا چکی اسی حقیقت کو دہرایا کہ اوباما کی ٹیم کا ایک بھی فرد پاکستان کو آپریشن میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دو پاکستانی شہریوں کے قاتل سی آئی اے ایجنٹ ریمنڈ ڈیوس کی وجہ سے پیدا ہونے والے بحران نے اسامہ بن لادن آپریشن کا منصوبہ تاخیر کا شکار کردیا تاہم ڈیوس کے رہا ہوتے ہی منصوبے کو تیز کردیا گیا۔

کتاب میں جو چیز نئی ملتی ہے وہ یہ کہ جب ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کی موجودگی کا شک ہوا تو سی آئی اے نے اسٹیلتھ ٹیکنالوجی کا حامل ایک انتہائی جدید نگران ڈرون طیارہ RQ-170 جاسوسی کے لیے ایبٹ آباد بھیجا تھا جس نے مزے سے پاکستان کے دفاعی ریڈار نظام کو توڑ کے اسامہ کے گھر پر خفیہ پروازیں کیں اور وہاں موجود حرکات وسکنات کی تصویریں کھینچیں اور اس سارے عمل کے دوران زمین پر موجود سی آئی اے ایجنٹس بن لادن کے گھر کا جائزہ لیتے رہے۔

سانگر پاک امریکا تعلقات کے ڈیڈ لاک پر اپنے موقف کو تفصیلی طور پر بیان کرتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ تعلقات کے اس بحران کا امریکا زیادہ ذمہ دار ہے اور اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان خطے کی جنگوں میں ایک بڑا شکست خوردہ ہے۔ واشنگٹن میں اب بھی اٹھنے والی ان تجاویز اور مشوروں کا حوالہ دیتے ہوئے کہ 'کیسے پاکستان سے نمٹا جائے' وہ بالکل درست تجویز دیتے ہیں کہ فی الحال امریکی سوچ ایک رویے کو ظاہر کرتی ہے نہ کہ کسی حکمت عملی کو۔ سانگر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ قطع تعلق کی ان دونوں امریکی تھنک ٹینکوں کی ایک فیشن ایبل سوچ، دراصل کوئی پالیسی نہیں بلکہ ایک اضطراری حرکت ہے (بشکریہ جنگ)۔